علامہ اقبال کی فارسی غزل

پروفیسر محمد منور

علّامہ اقبال کی فارسی غزل

پروفیسر محمّد مُنوّر

طبع اوّل :- جنوری ۱۹۷۷ء

تعداد اشاعت :- بارہ سو

طابع :- آصف پرویز

ناشر :- ایوانِ اُردو

ڈی ۴۳، بلاک "بی" نارتھ ناظم آباد کراچی

مطبع :- سول اینڈ ملٹری پریس۔ کراچی

قیمت :- ۲۲ روپے

انتسابؒ

ذہین طالب العلم، کامیاب استاد، صاحبِ طرز
ادیب، دراک ناقد، خوش ذوق شاعر، شیریں گفتار جلیس،
علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کے ارادت مند شیدائی اور میرے
عزیز دوست پروفیسر نصیر احمد زآر مرحوم کے نام

؎ گزشت و سوختم از انتظار باز ندید
دریں دیار مگر رسم باز دیدن نیست

ے زرسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جُز اینکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق

ـــــــ اقبال

زشعرِ دلکشِ اقبال میتواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید

——— اقبال

چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند

——— اقبالؔ

فہرست

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست !
یک چمن گل، یک نَیَستاں نالہ، یک خُمخانہ مے!
——— اقبال

مقدمہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی
پیپلز اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد

علامہ اقبال کی مفکرانہ اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کر لیا گیا تھا۔ برِصغیر اور دوسرے ممالک کے ممتاز اہلِ قلم نے حضرتِ علامہ کے فکر و فن کو اپنی نگارشات کا موضوع بنایا۔ یہ سلسلہ اُس وقت سے آج تک جاری ہے ــــــ اقبالیات کے اس سرمایے کی مقدار تو خاصی حوصلہ افزا ہے ــ لیکن مستثنیات سے قطع نظر معیار کے اعتبار سے یہ سرمایہ یا اس کا بیشتر حصّہ چنداں وقیع نہیں۔ اس میں ابھی اضافے کی بڑی گنجائش ہے۔

ذخیرۂ اقبالیات میں معیاری تحریروں کی کمیابی کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اقبال جیسے وسیع المطالعہ، عظیم مفکر اور بلند پایہ شاعر کے بارے میں لکھنا آسان بھی تو نہیں۔ صرف عقیدت کے بل بوتے پر یہ منزل طے نہیں ہو سکتی، اس لیے عقیدتمندی کے زور پر لکھی ہوئی تحریروں میں سطحیت زیادہ اور گہرائی کم ہے۔ یومِ اقبال کو فرمائشی پروگرام سمجھ کر لکھنے والوں کے "نغمے" بھی "سودائے خام" ہی رہتے ہیں کیونکہ ان میں خونِ جگر کی آمیزش نہیں ہوتی۔ اقبال شناسی کے لیے جس ظرف و ذہن کی ضرورت ہے،

علم و فضل کے باوصف، وہ بہت کم اقبال شناسوں کو نصیب ہوا۔

بعض فضلاء کو مطالعۂ اقبال سے جو خود شناسی حاصل ہوئی وہ ان کو اپنی خود فریبی میں مبتلا کر گئی۔ لہٰذا وہ خود کو علامہ اقبال سے زیادہ بلند جاننے لگے۔ ایسے عالی حوصلہ اور خوش نظر لوگوں سے علامہ اقبال کے حق میں انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس ضمن میں وہ "فارمولا نقاد" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جنھیں اپنے مزعوم تنقیدی پیمانے کا موہوم تقدس ہمیشہ عزیز رہا۔ انھوں نے موضوع کی وسعت اور پیمانے کی ظرفیت کا خیال کیے بغیر ہر موضوع کو اسی پیمانے سے جانچا۔ کلامِ اقبال بھی ان کی زد سے نہیں بچ سکا، پھر بعض ایسے دانشور بھی ہیں جو غیر جانب داری اور انصاف پسندی کے خوشنما الفاظ کا سہارا لے کر تنقید و تحقیق کے میدان میں آتے ہیں، یہ لوگ تنقید میں بے لاگ ہونے کے وہم میں اکثر بے لحاظ ہو جاتے ہیں۔ بعض اہلِ تحقیق کو ذوقِ تحقیق سے زیادہ عارضۂ تفتیش لاحق ہوتا ہے۔ ان کا واحد مشغلہ کسی طرح یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرتِ علامہ کی گٹھڑی میں خود ان کا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔ ان کی گٹھڑی میں تمام تر مال مسروقہ ہے اور مال مسروقہ کی برآمدگی کارِ خیر ہے ——— یہ لوگ بڑے فنکارانہ انداز سے اقبال کی خوبیوں کو خامیوں میں بدلنے کی سعیٔ بلیغ فرماتے رہتے ہیں۔

علامہ اقبال کے بارے میں لکھنے والے اس انبوہِ کثیر میں ان لوگوں کا وجود غنیمت معلوم ہوتا ہے جو علامہ اقبال کے بارے میں مخلص ہیں ——— استاذی پروفیسر مرزا محمد منور صاحب اہلِ قلم کے اسی زمرے میں آتے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ بیس سالوں میں علامہ اقبال پر چند بلند پایہ مقالے سپردِ قلم کیے ہیں۔ ان کے مقالات کا مجموعہ "میزانِ اقبال" ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

علامہ اقبال، مرزا صاحب کے لیے ایک مشن اور مسلک کی حیثیت رکھتے ہیں عقیدت کے ساتھ ساتھ وہ دولتِ علم سے بہرہ ور ہیں، دین سے محبت ہے اور دینی مطالعہ خاصہ وسیع ہے۔ عربی زبان وادب کے عالم، فارسی شاعری کے عاشق، انگریزی ادب کے شیدا، اردو کے استاد، تصوّف کے رسیا، فلسفے کے وارفتہ، مزاج میں طنز و مزاح کا جوہر موجود جس پر "اولادِ آدم" گواہ ہے ——— اس پر مستزاد یہ کہ خوش فکر شاعر ہیں "غبارِ تمنّا" شاہد ہے ——— اور پھر اس سب کچھ کے باوصف کسی زعم میں مبتلا نہیں۔ ذہن مستقیم ہے اور قلب سلیم۔ استادانہ رکھ رکھاؤ اور درویشانہ آزادہ روی کا امتزاج ——— انھی اوصاف کی بنا پر مرزا صاحب علامہ اقبال پر لکھنے کے لیے موزوں اور جامع الشرائط شخص ہیں۔ علامہ اقبال کی فارسی غزل پر زیرِ نظر کتاب ان کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔ مرزا صاحب نے علامہ اقبال کی فارسی غزل کو فارسی شاعری کی روایتِ غزل کے پس منظر میں رکھ کر اس کا مقام متعین کیا ہے۔

علامہ اقبال فارسی شاعری کی شعری روایت سے پوری طرح آگاہ تھے اور یہ آگہی انھیں فارسی شاعری کے گہرے مطالعے کے باعث حاصل ہوئی تھی، فارسی میں ان کی قدرتِ کلام کے علاوہ کثرتِ مطالعہ کا اندازہ اُن فارسی شعرائے کے ناموں سے ہو جاتا ہے جو کلامِ اقبال میں عنواناً، تضمیناً یا ضمناً آئے ہیں، ان میں فردوسی، انوری، سعدی، حافظ، رومی اور نظامی جیسے صفِ اوّل کے شعراء اور امیر خسرو، بیدل، جامی، خاقانی، منوچہری، صائب، عرفی، عطار، غالب، ناصر خسرو اور غنی کاشمیری جیسے مقبول و معروف شعراء شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ انیسی شاملو،

رضی دانش، ملّا عرشی، ملک قمی، عزت بخاری وغیرہم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جن میں سے بیشتر کا کلام تذکروں یا سیاحتوں میں پایا جاتا ہے ــــــ ان سب شعرا کا کلام علامہ اقبال کی نظر سے گذرا اور حسب مراتب ان کی صدائے بازگشت کلام اقبال میں سنائی دیتی ہے۔ مرزا صاحب نے علّامہ اقبال کی فارسی غزل کے سلسلے میں ان شعرا کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے جن سے علامہ اقبال نے زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ ان میں حافظ، نظیری، رومی، امیر خسرو، فغانی، بیدل اور غالب کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

اس کتاب کا سب سے دلچسپ اور توجہ طلب حصہ وہ ہے جہاں مرزا صاحب نے کلام اقبال پر حضرتِ حافظ شیراز کے فنّی اثرات سے بحث کی ہے ــــ مرزا صاحب کو علّامہ اقبال سے جو عقیدت ہے وہ تو ان کے ہر دوست اور شناسا بلکہ غائبانہ متعارفین پر بھی بخوبی عیاں ہے مگر انھیں خواجہ حافظ سے بھی بڑی محبت ہے ــــ اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے ــــ اقبالیات کا ایک اہم موضوع ہے اور مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد تو حافظ کے بارے میں علامہ اقبال کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہو گیا تھا لیکن مرزا صاحب نے بڑی کاوش سے ان فاصلوں کے بجائے خواجہ حافظ اور علّامہ اقبال کے ذہنی روابط کی تفصیلات مرتب کی ہیں۔ ان کے خیال میں علّامہ اقبال مثنوی اسرار خودی کی تالیف سے پہلے اور حتّٰی کہ ضربِ کلیم کی اشاعت (۱۹۳۶ء) تک حافظ کے کمالِ فن کے معترف رہے۔ مرزا صاحب نے اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات بیان کیے ہیں۔

(الف) ۱۹۰۷ء میں قیام انگلستان کے دوران میں علّامہ نے عطیہ فیضی کے ساتھ

ساتھ ایک ملاقات کے موقع پر یہ فرمایا "میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اس وقت ان کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گُم ہو کر رہ جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔

(ب) ۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال Stray Reflections میں لکھتے ہیں

In worlds like cut jewels Hafiz put the sweat unconscious spirituality of the nightingale.

(ج) ۱۹۱۹ء میں مارشل لا کے زہر آشوب دَور میں علامہ اقبال کو شعر حافظ سے تسکین ملتی ہے۔ یورپ میں نپولین گردی کے دَور میں گوئٹے کو بھی اسی طرح کلام حافظ میں سکون ملتا تھا۔

(د) مرزا صاحب نے علامہ اقبال کی جن دو ابتدائی غزلوں کی نشاندہی کی ہے وہ دونوں حافظ ہی کے تتبع میں کہی گئی ہیں۔

(ر) اس کتاب میں حافظ و اقبال کی تقریباً دو درجن ہم زمین و ہم طرح غزلیں دی گئی ہیں۔ پیامِ مشرق کی وہ غزلیں اس کے علاوہ ہیں جو حافظ کے رنگ و اسلوب میں ہیں بلکہ "مے باقی" کا عنوان بھی حافظ ہی سے ماخوذ ہے۔

(س) ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں "ایجادِ معانی" کے زیرِ عنوان ایک نظم میں حافظ کے فنی کمال کا ذکر تعریفی انداز میں آیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود علامہ اقبال اور خواجہ حافظ کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس سے قارئین اقبال کو تھوڑی سی الجھن ضرور ہوتی ہے کہ علامہ اقبال خود کلامِ حافظ سے اس قدر متاثر ہیں لیکن دُوسروں کو اس سے بچنے

کی تلقین کرتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ حافظ فارسی غزل کا نقطۂ کمال ہیں۔ اور علامہ اقبال، حافظ کے اس مرتبے کو تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے حافظ کے طرز و اسلوب کی تعریف بھی کی ہے اور تقلید بھی۔ لیکن جہاں تک حافظ کے افکار کا تعلق ہے ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر علامہ اقبال نے کہیں ان کے بارے میں مُثبت رائے کا اظہار نہیں کیا۔ حافظ کی غزل کو علامہ اقبال حسنِ بیان کا معجزہ ضرور جانتے ہیں لیکن علامہ اقبال صرف شاعر نہیں۔ وہ حکیم الاُمّت بھی تھے۔ شاعر اقبال تو حافظ کے زیرِ اثر رہے، مگر حکیم الامّت، امّت کے وسیع تر مفاد میں حافظ کے ساتھ نہیں چل سکے۔ وہ تو حافظ کو صوفی بھی ماننے پر تیار نہیں۔

مولانا جامی جیسے عظیم صوفی اور قریب العہد شاعر نے خواجہ حافظ کو "ترجمان اسرار" اور "لسان الغیب" لکھا ہے اور حافظ کے معاصر حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے حافظ کو ولی کامل قرار دیا ہے، مرزا صاحب کو اس بات پر حیرت ہے کہ علّامہ ان دو شہادتوں کے باوصف حافظ کو صوفی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ـــــــ بہر حال اگر حافظ کا صوفی ہونا ثابت بھی ہو جائے جب بھی بات وہیں رہتی ہے۔ اس لیے کہ علّامہ اقبال اس تصوّف ہی کے خلاف ہیں جو حافظ کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ اس مقام پر مرزا صاحب نے حافظ کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم تک پہنچتے حافظ کی غزل اپنے اصلی سیاق و سباق سے کٹ چکی ہے، غزل کی رمزیّت کا یہی کمال ہے کہ معاصرین اس سے بھرپور معنیٰ حاصل کرتے ہیں اور عصر مابعد کے لوگ کسی رمزیّت کی عام مروّج و مقبول تعبیر سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ پھر یہ کہ خواجہ حافظ کے ملفوظات نہیں۔ کوئی ٹھوس اور مکمل سوانحِ حیات نہیں۔ دیوانِ غزل کے ارد گرد کوئی مثنوی وغیرہ کی سی شئے

نہیں۔ جس طرح ہم مولانا روم کی غزلوں کی گرما گرمی کو ان کی "مثنوی" اور "فیہ ما فیہ" کی روشنی میں دیکھتے ہیں اُس طرح حافظ کے ضمن میں سہارے اور اشارے موجود نہیں، پھر یہ کہ عہد انحطاط میں سہولت پسند طبقوں نے وہ شعر اور غزلیں زیادہ پسند کیں جو ترک سعی و عمل کی افیون لیے ہوئے ہیں ــــــ ظاہر ہے کہ شاعر ہر حال میں ایک سا نہیں رہتا، کبھی مایوسی کا دورہ پڑتا ہے۔ کبھی سرشاری کا کبھی عملاً یا خیالاً مایوسی کو غرقِ شراب کرنے کے مضامین باندھے جاتے ہیں اور کبھی شور و شغب سے بھاگ کر کہیں دُور کسی خلوتِ راز میں پناہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ مزید یہ کہ حافظ کی کون سی غزل کس دور کی ہے ۔ چند ایک غزلوں کو چھوڑ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے ۔ ثُم مزید یہ کہ حافظ نے اپنا دیوان خود مرتب نہ کیا تھا ورنہ وہ دیکھتے کہ جو چیز اپنے پیچھے چھوڑے جا رہے اس میں سے کیا کچھ تنسیخ کے لائق ہے وغیرہ ــــــ اب ظاہر ہے کہ دیوانِ حافظ میں یاس اور ترک کے مضامین بھی ہیں اور اُمید و رجا اور ہمت و دعا کے بھی ــــــ مرزا صاحب حافظ کی بدنامی یا رسوائی کا ذمّہ دار حافظ کے بجائے انتخاب کنندگان کو قرار دیتے ہیں جو درس بغاوت دینے والی اور تلقین ریاضت و خود نگہداری کرنے والی غزلوں کے بجائے اپنی کاہلی کے تناسب سے سُکر اور ترک کے مضامین کی مالک غزلیں چُن لیتے ہیں ــــــ لیکن یہ دلیل حافظ کو شک کا فائدہ پہنچانے کی ایک مخلصانہ کوشش معلوم ہوتی ہے۔

مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ خواجہ حافظ کے بعد علّامہ اقبال سب سے زیادہ متأثر مقلّدِ حافظ یعنی نظیری نیشاپوری سے ہیں ــــــ علّامہ تو نظیری کے ایک مصرعے کو ملک جم سے بڑھ کر جانتے تھے (بملک جم ندھم مصرعۂ نظیری را) ــــــ مُرشد رومی کے آہنگ اور ترنگ نے بھی علّامہ اقبال کی غزل پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ موسیقیت

اور سادگی حضرتِ خسرو کی غزل کی جان ہے۔ علامہ اقبال نے ان کی غزلوں پر بھی چند غزلیں کہی ہیں۔ اس کے بعد اقبال کی ان غزلوں سے بحث کی گئی ہے جو انھوں نے فغانی، عرفی، بیدل، غالب اور عراقی کی پیروی میں لکھیں اور اقبال پر ان شعرا کے اثرات کی کیفیت و نوعیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے بڑی ہمت سے کام لے کر ان عظیم شعرا کے ضخیم دیوان کھنگالے اور ہم طرح غزلوں کا سُراغ لگایا ——— فارسی شاعری کے بحرِ بیکراں میں اس تقابلی مطالعے کا مواد نکالنا آسان بات نہیں ان دواوین میں ڈوبنا آسان ہے مگر ڈوب کر اُبھرنا خاصہ محال ہے۔ مرزا صاحب تو اردو کے استاد ہیں، آج خود فارسی کے اساتذہ میں ایسے لوگ شاذ ہی ہوں گے جنھوں نے فارسی شعرا کے اتنے دیوان اس توجہ سے پڑھے ہوں۔

مرزا صاحب کو اس بات کا خود بھی احساس ہے کہ ہم طرح غزلوں کا موازنہ کوئی اچھا پیمانۂ تنقید نہیں۔ لیکن اس طریق سے کم از کم فارسی غزل کی روایت سے علامہ اقبال کے تعلق پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال نے اکابر شعرا فارسی کی غزلوں پر کامیاب غزلیں کہیں لیکن وہ محض مقلد نہیں بلکہ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر دوسرے شعرا سے منفرد ہیں۔ اس مطالعے سے مرزا صاحب کی یہ نتیجہ گیری بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کو نہ تو کسی ایک شاعر کا ضمیمہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی ایک خاص سبک (اسلوب) کا پیرو۔ علامہ اقبال کی غزل میں سارے سُبک موجود ہیں اور وہ سب مل جُل کر ایک نیا سبک بن جاتے ہیں جسے مرزا صاحب "سبکِ اقبال" کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کی یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ علامہ اقبال کے درجنوں

اشعار ایسے ہیں جو مخصوص اقبالی مضامینِ نادرہ کے باعث کسی بھی فارسی شاعر کے کلام میں ضم نہیں ہو سکتے خواہ وہ انھیں میں سے کسی کے اسلوب و آہنگ میں کہے گئے ہوں۔ علامہ اقبال نے غزل کے لطیف پیرائے میں جن مضامین کو بیان کیا ہے وہ بظاہر غزل کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے، لیکن انھوں نے غزل کے رموز و علائم کو نئی معنویت عطا کر کے اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ مضامین غزل سے پُوری طرح متوافق ہو گئے ہیں۔ یہ بات کہہ کر مرزا صاحب نے پروفیسر آر بھری کی رائے کی تائید کی ہے کہ علامہ اقبال غزل کی قدیم ہیئت پر جدید فلسفے کا ملبوس پڑھا کر اسے ایک منزل آگے لے گئے ہیں۔ علامہ اقبال بقول مرزا صاحب، غزل میں ریزہ خیالی کے زیادہ پابند نہیں' ان کی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں۔ اس قسم کی غزلیں قدیم شعرائے کے ہاں بھی ملتی ہیں اور جدید شعرا کے ہاں بھی۔ اس لیے محض ریزہ خیالی کا فقدان غزل کو غزل کے دائرے سے خارج نہیں کرتا۔ علامہ اقبال نے "زبورِ عجم" کی غزلوں کو "غزل نما ٹکڑے" قرار دیا لیکن انھیں غزلیں کہہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ـــــ علامہ اقبال کی غزلِ مسلسل مرزا صاحب کے ذہن میں عربی غزل کی یاد تازہ کر دیتی ہے ـــــ

مرزا محمد منور بنیادی طور پر ایک استاد ہیں اور ان کی تحریروں میں مُعلمانہ رنگ بھی جھلکتا ہے۔ وہ مُعلّم ضرور ہیں لیکن غرورِ علم میں مبتلا ہو کر مخاطبوں پر اپنے علم کے تازیانے نہیں برساتے اور نہ قارئین کو بحکمِ کلام جاہل سمجھ کر کسی بلند سطح سے ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب ایک مشفق استاد کی طرح اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ مثالوں سے بات کی وضاحت کرتے ہیں، مثالوں کی کثرت ایک طرف تو ان کے وسعتِ مطالعہ کی دلیل ہے اور دوسری طرف ان کے مقالات کی ایک نمایاں خصوصیت بھی ہے۔

اقبال کی فارسی غزل کوئی نیا موضوع نہیں، لیکن مرزا صاحب نے اس میں کیسے کیسے نکات پیدا کیے ہیں اور پھر جس جامعیت کے ساتھ اس موضوع کا حق ادا کیا ہے اس کی مثالیں شاذ ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک تسلّی بخش کوشش کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اقبال اور فارسی کے دوسرے کئی نامور غزل گو شعرائ کے منتخب اشعار کا اچھا خاصہ مجموعہ بھی ہے ـــــ یہ انتخاب مرزا صاحب کی خوش ذوقی اور خوش فکری کا آئینہ دار ہے۔

مرزا صاحب کے مقالات میں بعض ضمنی باتیں بڑی اہمیّت کی حامل ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر موضوع میں بھی ایسی دو ضمنیّات موجود ہیں اور دونوں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ علّامہ اقبال نے فارسی گوئی کا آغاز کب کیا۔ علّامہ اقبال کے تقریباً سب محققین سر عبدالقادر مرحوم کی رائے سے اتّفاق کرتے ہیں کہ اقبال کی فارسی گوئی کا آغاز ۱۹۰۷ء میں ایک اتّفاقی واقعہ سے ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی بھی اس رائے سے متفق نظر آتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر اکرم شاہ صاحب نے بھی اس سلسلے میں قطعیت سے کوئی بات نہیں کہی۔ مرزا صاحب نے سر عبدالقادر کے بیان کا تحقیقی جائزہ لیا ہے، ان کی حیرت بجا ہے کہ سر عبدالقادر کے اپنے مجلّے "مخزن" میں علّامہ اقبال کا فارسی کلام ۱۹۰۵ء میں چھپ چکا تھا اور وہ ابھی انگلستان نہیں گئے تھے۔ اس کے باوصف سر عبدالقادر نے لکھا کہ اقبال کی فارسی شعر گوئی کا آغاز لندن میں ایک اتفاقی واقعے سے ہوا۔ مرزا صاحب نے سید نذیر نیازی صاحب کی تائید کی ہے کہ علامہ اقبال لاہور آنے سے قبل ہی فارسی میں شعر کہنے لگے تھے۔ خود علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا ہے :

"لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آ گئی جبکہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی، انھیں معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے اسکول ہی کے زمانے سے کس قدر زحمت اٹھائی اور اساتذہ سے استفادہ کیا۔"

(مکاتیب اقبال۔ حصہ اول۔ ۳۴۲)

مرزا صاحب نے مختلف ذرائع سے علامہ اقبال کے ۵۶ (چھپن) ایسے فارسی اشعار اس کتاب میں درج کیے ہیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے کہے۔

دوسری ضمنی مگر بڑی اہم بات مرزا صاحب نے یہ لکھی ہے کہ غزل کو قصیدے کی تشبیب و نسیب سے الگ کر کے اسے ایک مستقل صنفِ سخن بنانے والوں کا سرخیل اموی دور کا عربی شاعر عمر بن ابی ربیعہ اور اس کے ایک دو معاصر تھے۔ لیکن اردو اور فارسی کے محققین کا خیال یہ رہا ہے کہ غزل کو قصیدے سے ایرانیوں نے الگ کیا۔

غزل کے ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت اختیار کرنے کے بارے میں چند محققین اور نقاد حضرات کی آرا کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ علامہ شبلی نعمانی شعر العجم میں فرماتے ہیں :

" فارسی شاعری کا آدم رودکی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آ چکی تھی۔

(شعر العجم جلد ۵، ص ۳۳)

ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتا نے اپنے تحقیقی مقالے " عربی شاعری کا فارسی شاعری کے ارتقار پر اثر" (انگریزی) ــــــ میں اس موضوع پر اس طرح اظہار خیال

کیا ہے:

"غزل عربوں کی اختراع نہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں یہ قصیدہ کی تشبیب تھی جسے بعد میں الگ کرلیا گیا۔ (ترجمہ)

(ص-۶۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خیال میں

"اُردو غزل کا سلسلۂ نسب فارسی سے ہوتا ہوا عربی تک پہنچتا ہے۔ لیکن عرب کی ہر تحریک خواہ وہ مذہب و اخلاق سے تعلق رکھتی ہو، یا شعر و ادب اور تہذیب و تمدّن سے ایران کے مکتب و میخانہ سے رنگ و بُو لیتی ہندوستان پہنچی ہے۔ اس لیے اُردو غزل میں عربی، ایرانی دونوں رنگ ملتے ہیں"

(جدید غزل۔ مطبوعہ ۱۹۵۵ء، ص۔ ۷)

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی سے پہلے یقیناً اس کا مستقل وجود نہ تھا۔ اور غالباً نویں صدی (عیسوی) کے اواخر تک یا اس سے بھی پہلے فارسی گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ رودکی جو پہلا صاحبِ دیوان غزل گو شاعر ہے دسویں صدی کے نصف اوّل میں گزرا ہے" (منقول از اصول انتقادِ ادبیات ص ۷۶-۲۷۵)

پروفیسر عابد علی عابد مرحوم کے خیال میں یہ فرض کرنا درست نہیں کہ رودکی پہلا صاحبِ دیوان غزل گو شاعر تھا۔ ان کے نزدیک رودکی سے پہلے بھی شعرا ملتے ہیں جنھوں نے

غزل کہی ——— (ایضاً، حواشی ص - ۲۷۷)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ فرماتے ہیں :

"..... رودکی اور اس کے معاصروں نے شاید پہلی مرتبہ غزل کو قصیدے کے حصار سے نکال کر ایک مستقل صنف کی حیثیت دی"

(مباحث ۵۵۱)

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں

"عرب کی شاعری میں وہ صنف نہیں جس کو اصطلاحاً غزل کہتے ہیں۔ اگرچہ غزل عربی زبان کا لفظ ہے" (مجنوں گورکھپوری نگار پاکستان اصناف شاعری نمبر ص۔ ۳۶)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایران و ہندوستان کے کلچر، تہذیب، مذاق اور معاشرت سب کو غزل سے منسوب کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عرب یا عربی شاعری کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

ڈاکٹر محمد اسلام اردو غزل کی مختصر تاریخ میں لکھتے ہیں

"غزل عرب میں کوئی مستقل شکل اختیار نہ کر سکی، لیکن ایران پہنچ کر یہ ایک مستقل صنف بن گئی"۔

ان آرا میں بڑی قطعیت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ غزل ایران میں آکر قصیدے سے الگ ہوئی۔ صرف پروفیسر رشید احمد صدیقی نے یہ بات صراحت سے نہیں کہی۔ انھوں نے عربی کا دم ضرور مارا ہے لیکن ان کی رائے اردو کے باقی فضلا کی تردید نہیں کرتی جبکہ مرزا محمد منور کا خیال ان سب سے الگ ہے کہ غزل، عربوں کے ہاتھوں ہی قصیدے

سے الگ ہو چکی تھی۔ ہاں "ردیف" خالص ایرانی اضافہ ہے اور وہ اضافہ فقط غزل ہی کے اشعار میں نہیں۔ وہ ہر صنف کے اشعار میں ترنم افزائی کر رہا ہے ـــــ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ایرانی فضلا کے خیالات کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔

ایرانی فضلا (استاد جلال ہمائی۔ ڈکٹر صفا، ڈکٹر محجوب موتمن) غزل کو قصیدے سے الگ کرنے کا سہرا فارسی شعرا کے سر باندھتے ہیں۔ ان کے خیال میں فارسی کے اوّلین ادوار (صفاری وسامانی) ہی میں فارسی غزل وجود میں آ چکی تھی۔ یہ لوگ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ غزل کب اور کس کے ہاتھوں قصیدے سے الگ ہوئی۔ دراصل اس مسئلے پر نتیجہ خیز بحث ممکن بھی نہیں کیونکہ فارسی شاعری کے ان ادوار کا بیشتر کلام ضائع ہو چکا ہے صفاری اور سامانی دَور کے لاکھوں اشعار میں سے صرف تین ہزار کے قریب اشعار باقی بچے ہیں اور یہ اشعار بھی لغت، تذکرہ اور تاریخ کی کُتب سے جمع کیے گئے ہیں ـــــ

قصیدے اور غزل کی ہم ہیئتی کی وجہ سے بھی اس بحث میں الجھاؤ پیدا ہُوا ہے، جن منظومات کو غزل سمجھا جا رہا ہو ممکن ہے کسی ادھورے قصیدے کی تشبیب ہو۔ فارسی شاعری کا آغاز عربی شاعری کی تقلید میں قصیدہ گوئی سے ہُوا ـــــ صفاری دَور کے شاعر محمد بن وصیف کے اس قصیدے کو اب فارسی زبان کا پہلا قصیدہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جو اس نے ۲۵۱ھ میں کہا تھا۔ اس لیے مذکورہ بالا دو ادوار میں قصیدے ہی زیادہ کہے گئے۔ چونکہ کلام کا زیادہ حصہ ضائع ہو چکا ہے اس لیے ادھورے قصیدے ملے ہیں جن پر غزل کا گمان ہو سکتا ہے۔

سلطان محمود کے ملک الشعرا، عنصری (م۔ ۴۳۱ھ) کا ایک معروف مصرعہ ہے۔

"غزلہائے من رودکی وار نیست"

عنصری کا دیوان آقائے دکتر دبیر ساقی کے اہتمام سے تہران سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس دیوان میں ایک بھی غزل موجود نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عنصری کوئی غزل کہے بغیر اپنی غزلوں کو رودکی کے مقابلے میں کمزور کس طرح قرار دے رہا تھا۔ لیکن اس کی ایک توجیہہ یہ بھی کی گئی ہے کہ تشبیب کے لیے غزل و تغزل کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ ممکن ہے عنصری نے اپنی تشابیب کا مقابلہ رودکی کی تشابیب سے کیا ہو۔ مگر یہ توجیہہ کچھ زیادہ وقیع معلوم نہیں ہوتی۔ ایک تو یہی بات عجیب لگتی ہے کہ شاعر کسی صنف کے ایک جز کا مقابلہ دوسرے شاعر کی مستقل صنف سے کرے، پھر عنصری کی تشابیب خاصی زور دار ہیں۔ علاوہ ازیں رودکی کے معاصر شہید بلخی (م ۳۲۸ھ) کی غزلیں بھی خاصی شہرت رکھتی تھیں۔ لیکن یہ شاعر بطور قصیدہ گو زیادہ مشہور نہیں ——
اس لیے شہید کی غزل کا مطلب تشبیب نہیں لیا جا سکتا۔

ممتاز روسی محقق عبد الغنی میرزا یف نے اپنی گراں مایہ تصنیف "ابو عبداللہ رودکی" میں رودکی کو فارسی غزل کے ارتقاء کی ایک اہم کڑی قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں بہترین عاشقانہ اشعار جو اصطلاحی غزل سے قریب تر ہیں، پہلی بار رودکی کے ہاں نظر آتے ہیں مرزا یف نے رودکی کے عاشقانہ اشعار کو غزل مانند (غزل نما) کہا ہے۔ جو غزل سنائی، انوری، ظہیر فاریابی اور عطار سے ہوتی ہوئی، سعدی اور حافظ کے ہاتھوں اپنے کمال کو پہنچی، اس کے سامنے رودکی کی غزل "غزل نما" ہی کہلا سکتی ہے۔ بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل رودکی کے زمانے میں موجود تھی، لیکن کسی محقق نے رودکی یا شہید بلخی یا سامانی دور کے کسی شاعر کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ اس نے غزل کو قصیدے سے الگ کیا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ابتدائی عہد کے فارسی شعرا نے جس طرح قصیدے

میں عربی شاعری کی تقلید کی ہے اسی طرح غزل میں بھی کی ہو۔ کیونکہ مرزا محمد منور صاحب کے بقول غزل اموی دور ہی میں قصیدے سے الگ ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس موضوع پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور مرزا صاحب سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عربی غزل کی روایت پر کوئی بھرپور مقالہ یا کتابچہ مرتب کر کے اس گتھی کو سلجھائیں اور ایک بہت بڑی تاریخی ضرورت پوری کریں۔

میں نے عرض کیا تھا نا کہ مرزا صاحب کے موضوعات میں وارد ضمنیات بڑی اہمیت کی مالک ہوتی ہیں ـــــــ بہرحال بات کو مزید طول نہیں دیتا ـــــــ اُمید واثق ہے کہ اہلِ نظر قارئینِ کرام علامہ اقبال کی فارسی غزل پر اس عالمانہ اور تحقیقی اور خوش لہجہ کتاب سے خاصہ استفادہ کر سکیں گے ـــــــ

اعتذارِ مصنّف

خدا گواہ ہے کہ میں نے تو حضرتِ علّامہ اقبال کی فارسی غزل پر کبھی کوئی مقالہ لکھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا چہ جائیکہ کتاب مرتب کر کے آپ کو زحمتِ مطالعہ دیتا ـــــــ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے حضرتِ علّامہ کی فارسی غزل سے شغف نہ تھا، شغف تھا اور بے حد، مگر مَیں خود کو ہرگز اس قابل نہ جانتا تھا کہ اس موضوع کا حق ادا کر سکوں۔

آپ کو معلوم ہے بعض اوقات آدمی بے گناہ بھی پکڑ لیا جاتا ہے، میں بھی پکڑ لیا گیا۔ ہُوا یوں کہ حبیبِ لبیب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو "صحیفہ" کا اقبال نمبر نکالنا تھا، چنانچہ انھوں نے عنوانوں کی فہرست بنائی اور پھر عنوانوں کے مطابق مقالہ نگار تلاش کرنے شروع کیے، قضاراً "علّامہ اقبال کی فارسی غزل" کے باب میں انھوں نے مجھ غریب کو دھر پکڑا۔ میں نے بخلوصِ خاطر معذرت پیش کی مگر میں جوں جوں معذرت کرتا توں توں ان کا اصرار بڑھتا۔ میچ سخت تھا مگر آخر کار ہار گیا۔

سہ زدُور گردیِ مَن از غرور میخندد
حریفِ سخت کمانے کہ در کمیں دارم

والی بات تھی ـــــــ مَیں جانتا تھا کہ موضوع اہم بھی ہے، وسیع بھی اور خطیر بھی، مجھے یقین تھا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں، اس کے برعکس ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو اعتماد تھا کہ مَیں بخوبی یہ کام کر لوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول اس اعتماد کی بنیاد استوار کرنے کا ارتکاب خود مجھی سے ہُوا تھا، وہ اس طرح کہ قبل ازیں ڈاکٹر صاحب ہی کی فرمائش پر ایک مقالہ "مرزا غالب کی فارسی غزل" تحریر کر چکا تھا اور ڈاکٹر صاحب کا گمان یہ تھا کہ اہلِ علم نے اسے پسند فرمایا تھا ـــــــ آخر مجھے اپنے دوست کی خوش فہمی کا احترام کرنا پڑا اور میں نے حامی بھر لی، اُمید ہے کہ اب قارئین کرام پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مجھ سے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کیونکر سرزد ہوئی ـــــــ الغرض یہ کتاب میں نے لکھی نہیں، مجھ سے لکھوائی گئی ہے۔ ہاں ڈاکٹر صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے مقالہ مانگا تھا، کتاب نہیں مانگی تھی، لیکن اگر کوئی مقالہ پھیل کر کتاب بن جائے تو کوئی کیا کرے۔

میں نے علّامہ اقبال کی فارسی غزل پر اظہارِ خیال کی تمہید کے طور پر کسی طویل باب کا اضافہ نہیں کیا، مراد ہے ایسا باب جس میں فارسی غزل کی عہد بعہد ترقی مندرج ہوتی، جس میں بتایا جاتا کہ لفظ غزل عرب جاہلیت و اسلام میں کن معانی پر دلالت کرتا رہا۔ ایران میں غزل کی صورت کیا بن گئی۔ پھر یہ کہ غزل عہد سامانی کے بخارا سے چل کر براستہ غزنی کس طرح لاہور پہنچی اور پھر کس طرح براستہ نیشاپور، شیراز، تبریز اور آگرہ دہلی میں وارد ہوئی۔ منزل بمنزل اس کی پذیرائی کس کس طرح ہوئی اور وہ کس کس طرح پھیلتی اور پھولتی رہی۔ مَیں نے اس تطویل کو تکلف بارد جانا اور فی البدیہہ یہ بحث شروع کر دی کہ حضرت علّامہ نے فارسی میں کب شعر کہنے شروع کیے تھے اور چونکہ ان کی ابتدائی فارسی غزلیں خواجۂ حافظ کے تتبع میں تھیں لہٰذا سب سے پہلے علّامہ اقبال اور خواجۂ حافظ کے روابط کا

ذکر آگیا۔ میں نے اپنے استاذ مکرّم ڈاکٹر سیّد محمّد عبداللہ صاحب کی طرح "صلح صفائی" کی کوشش کی ہے۔ تاہم ڈر ہے بعض اہلِ نظر یہ نہ کہیں کہ "صلح میں بات ہے لڑائی کی" ——— جب میں نے مرزا غالبؔ کی فارسی غزل پر قلم اٹھایا تو مرزا غالبؔ اور مرزا بیدؔل کا مبحث کھنچتا چلا گیا۔ یہاں حافظ کا باب کھُلا تو بند ہوتا نظر نہ آیا، بمشکل بند کیا۔

مرزا غالبؔ کے ضمن میں جب دیگر شعرائے فارسی کے مضامین کی پیروی کی بحث شروع ہوئی تو غالبؔ اور متقدّمین کے ہم قافیہ اشعار آمنے سامنے لائے گئے اس لیے کہ وہاں "گمانِ توارد" کی گنجائش تھی یہاں ایسا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ حضرتِ علّامہ غزل برائے غزل تو کہہ نہیں رہے تھے کہ قافیوں پر قافیے لگا کر پروازِ تخیل اور نُدرتِ ایجاد کی داد طلب کرتے ——— ان کے یہاں پیکرِ غزل تو روایتی تھا مگر مضامین محض پُرانے نہ تھے، نئے سے نئے مضامین جلوہ گر ہوئے، یعنی وہ سب کچھ علامہ اقبال کی غزل میں در آیا جو بیسویں صدی کے کسی بھی بیدار مغز، صاحبِ بصیرت فنکار اور صاحبِ دل مردِ مومن کی غزل کا سرمایہ ہونا چاہیے تھا۔ یہی سبب ہے کہ علّامہ اقبال کا آہنگ تو بالعموم وہی ہے جو کلاسیکی غزل کی شان ہے، بات بھی دل ہی کی ہے مگر اس کا کیا علاج کہ اس دل میں درد کے پہلو متنوّع ہیں۔ لفظاً ساقی وہی ہے مگر کس کس ادا کے ساتھ اور کس کس قبا میں۔ لفظاً شراب وہی ہے مگر کس کس طرح کی مستی اور کس کس طرح کی سرشاری سے سرمایہ دار، وعلیٰ ہذا میکدہ، پیرِ مغاں، بہار، خزاں، گل، لالہ، مُرغِ چمن، صیّاد، بلبل، طاؤس، شاہیں، سالک، رہروؔ، منزل وغیرہ علامات کیا تھے اور کیا ہو گئے

میں نے اس کتاب میں دیگر شعرائے فارسی کے ساتھ حضرتِ علّامہ کے کلام کا موازنہ کم کم کیا ہے اور یہ شماریات پیش کرنے کی کوشش زیادہ کی ہے کہ حضرتِ علّامہ نے

کسی شاعر کے تتبع میں تقریباً کتنی غزلیں کہیں، تاہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ جن شعرا کی زمینوں میں حضرت علاّمہ نے غزل کہی وہ فقط اتنے ہی تھے جن کا میں نے ذکر کردیا یا وہ غزلیں اتنی ہی تھیں جو دوسروں کے تتبع میں کہی گئیں، شاعر اور بھی ہوں گے غزلیں اور بھی ہوں گی ـــــ تاہم میری تصریحات سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ حضرتِ علاّمہ نے فارسی غزل کا کس قدر وسیع مطالعہ کر رکھا تھا اور فارسی غزل کا اثر ان کے دل و دماغ میں کتنا راسخ تھا ـــــ میں نے علاّمہ اقبال اور دوسرے شعرا کی ہم زمین غزلوں کے فقط مطلعے درج کیے ہیں پوری کی پوری غزل محض کہیں کہیں آئی ہے، اہلِ نظر، اہلِ ذوق اور ان سے بڑھ کر اہلِ شوق اُن غزلوں کو ان کے مطلعوں کی روشنی میں دیکھ لیں گے۔ حضرتِ علاّمہ کی غزلیں چونکہ ردیف کی ابجدی ترتیب کی مالک نہیں لہٰذا اُن کے آگے زبورِ عجم یا پیامِ مشرق کا صفحہ درج کردیا گیا ہے۔

یہاں یہ عرض کردینا بے جا نہ ہوگا کہ اس تقابلی مطالعے کو پہلے سے طے شدہ کسی نتیجے پر پہنچانا ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ یہ مطالعہ اپنی دلالتوں کے زور سے مجھے جس طرف لے گیا میں اسی طرف کو چلا یعنی علاّمہ اقبال دیگر اکابر شعرائے فارسی کے ہمدم کہاں تک ہیں اور باہم جدائی کہاں واقع ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ حضرت علاّمہ کو فارسی کے تین معروف مشخص سبکوں (اسلوبوں) میں سے کس سبک کے ساتھ وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ مَیں اپنی ناقص رائے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا کہ علاّمہ اقبال کی غزل ان تینوں سبکوں میں سے کسی ایک میں بھی سما نہیں سکتی۔ گویا ان کی غزل خود اپنی ذات میں ایک سبک ہے، سبکِ اقبال ـــــ

میں عزیزم ڈاکٹر محمد صدیق شبلی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اِن صفحات کو اپنے مبسوط اور محققانہ مقدمے سے مزیّن کیا، میں جناب ڈی سی بنزلے مینجنگ ڈائریکٹر

بروک بانڈ پاکستان لیمیٹڈ کا بہت ہی شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ پیش کش کی کہ وہ حضرت علامہ اقبال کی ولادت کے جشنِ صد سالہ میں شرکت کی خوشی اور اعزاز حاصل کرنے کے لیے اپنی مشہور اور نیک نام فرم کی طرف سے میری طرف سے دو کتابیں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں گے۔ میرے عزیز دوست مظفّر احمد بھٹہ صاحب بھی برابر کے مستحق شکریہ ہیں (خواہ وہ ایک دوست کی طرف سے اظہارِ تشکر کو ناپسند ہی کریں) یہ بات واضح کردوں کہ ان دو کتابوں کے ضمن میں سفیلے صاحب کے یہاں ادبی مشیر کی حیثیت ایک طرح سے بھٹہ صاحب ہی کو حاصل تھی، بھٹہ صاحب بروک بانڈ کراچی میں ڈائریکٹر ہیں —— میرے اظہارِ تشکر کی زد سے حضرت شیخ عبدالشکور صاحب بھی نہ بچ سکیں گے، شیخ صاحب میرے اور بھٹہ صاحب کے "پیرِ طریقت" ہیں۔ شیخ صاحب نے اِن کتابوں کے جلد شائع ہو جانے کے باب میں جس طرح بار بار تاکید و تلقین کی وہ لائق داد ہے اور ہاں بروک بانڈ پاکستان لیمیٹڈ نے پچھلے سال پروفیسر اقبال عظیم صاحب کا مجموعہ کلام "مضراب" بھی شائع کیا تھا۔ تجارتی اداروں کے لیے یہ مثال قابلِ تقلید ہے —— میری دوسری کتاب کا نام جسے بروک بانڈ شائع کر رہی ہے "ایقانِ اقبال" ہے۔ اس میں سات مقالے ہیں، جو حضرت علامہ کے مختلف موضوعات فکر و نظر سے تعلق رکھتے ہیں —— وباللہ التوفیق

(پروفیسر) محمد منوّر
شعبۂ اردو۔ گورنمنٹ کالج لاہور
فروری ۲۵ ، ۱۹۷۶ء

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

——— اقبال

علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز

بانگ درا ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ دیباچہ بانگ درا کے خاتمے سے قریب، صاحبِ دیباچہ سر عبدالقادر نے اپنی اردو پرستی کے باعث بڑی دلسوزی کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ قلمبند کئے:

"آخر میں اردو شاعری کی طرف سے میں یہ درخواست قابل مصنّف سے کرتا ہوں کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصّہ دیں جس کی وہ مستحق و محتاج ہے۔ خود انہوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

ہم ان کا یہ شعر پڑھ کر ان سے کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے لکھوایا تھا اس سے کام لے کر اب وہ پھر کچھ عرصے کے لئے گیسوئے اردو سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں یہ موقع دیں کہ ہم اس مجموعہ اردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے ایک دوسرے کلیاتِ اردو

کا پیش خیمہ سمجھیں"۔

سر عبدالقادر نے یہ التجائی کلمات اس لئے قلمبند کئے تھے کہ بانگِ درا سے قبل علامہ اقبال کے فارسی کلام کے تین مجموعے منظرِ شہود پر آ چکے تھے۔

اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء رموزِ بیخودی (۱۹۱۷ء) اور پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) اور جب بانگِ درا معرض وجود میں آئی تو اس وقت بھی علامہ اقبال کی توجہ زیادہ تر فارسی شعر گوئی ہی کی جانب تھی۔

ایک طرح سے بانگِ درا کے پہلے دو حصے علامہ اقبال کے دورِ تحصیلِ علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسرے حصے میں شامل بڑی نظمیں بالعموم وہ ہیں جو انہوں نے انجمنِ اسلامیہ لاہور کے اجتماعوں میں پڑھیں۔ ان "حولیات" (سالانہ نظموں) سے ہٹ کر دیکھیں تو اس دور میں علامہ اقبال کی عمومی توجہ کا خصوصی مرکز فارسی شعر گوئی رہا۔ خود بانگِ درا کی طباعت کے تکمیلی مراحل کے عرصے میں "زبورِ عجم" زیرِ تصنیف تھی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بانگِ درا ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس سے تقریباً دو ماہ قبل ۱۲ جولائی ۱۹۲۴ء کو علامہ اقبال نے خان نیاز الدین کے نام ارسال کردہ ایک خط میں اس امر کی اطلاع دی تھی:۔

"اردو مجموعہ چھپ گیا ہے۔ تقریباً دو ہفتے تک بالکل تیار ہو جائیگا شیخ عبدالقادر صاحب اس کا دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ جو کل انشاءاللہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی لکھائی چھپائی میں ایک ہفتہ لگ جائیگا"[1]

اس سے ظاہر ہے کہ بانگِ درا کا متن چھپ چکنے کے بعد دیباچہ تیار ہوا۔

---

[1] مکاتیب اقبال ابنام نیاز الدین خاں، بزمِ اقبال لاہور صفحہ ۸۰

علامہ اقبال کی توقع کے مطابق کتاب کو جولائی کے اواخر تک مکمل ہو کر شائع ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر وہ بہرحال شائع ستمبر میں ہوئی۔

اسی خط میں علامہ اقبال نے شاید "زبورِ عجم" ہی کی تیاری کی جانب یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا۔

"ایک چھوٹی سی کتاب لکھ رہا ہوں جس کا نام غالباً یہ ہوگا :۔

"Songs of Modern David" [1]

چنانچہ زبورِ عجم کے آغاز کی "دعا" یہ ہے :

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست
یک آہ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

سیلم مرا بجوئے تنک مایہ مپیچ !
جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گذاشتی !
ہمت بلند و چنگلِ ازیں تیز تر بدہ

رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار !
تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

---

[1] مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں بزم اقبال لاہور ص ۲۵

خاکم بنور نغمۂ داؤد برفروز !
ہر ذرّہ مرا پرو بال دگر بدہ

آپ نے دیکھا کہ آخری شعر "نغمۂ داؤد" کے نور سے مستنیر ہونے کی تمنا کا حامل ہے۔

علامہ اقبال نے فارسی اور عربی زبان و ادب کی تحصیل کے لئے شمس العلماء سید میر حسن کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ سید صاحب نے انہیں عربی اور فارسی اس طرح پڑھائی کہ اُن کی طبیعت میں رچ بس گئی۔ اس باب میں سر سید عبدالقادر کہتے ہیں :-

"اِن (سید میر حسن) کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں . . . . طبیعت میں علم و ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی سونے پر سہاگہ ہو گیا۔" [۱]

رہا یہ سوال کہ علامہ اقبال نے سید میر حسن سے کونسی فارسی کتب پڑھیں تو اس بارے میں سر عبدالقادر نے کوئی رہبری نہیں فرمائی۔ اس ضمن سید عابد علی عابد کسی قدر ممد ہوتے ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے :

" . . . . اور اس زمانے کے معمول کے مطابق شاہ صاحب نے

---

[۱] دیباچہ بانگ درا صفحہ د

اقبال کو گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، انوارِ سُہیلی، اور تصانیف ظہوری کا درس دینا شروع کیا۔" [1]

مگر عابد صاحب نے اس باب میں کوئی حوالہ یا سند نقل نہیں کی، ہاں تو چند ہی سطور کے بعد اسی صفحے پر عابد صاحب بطریقِ وضاحت لکھتے ہیں

"میر حسن شاہ نے جب اقبال کو گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، انوارِ سُہیلی اور ظہوری کی تصانیف پڑھائیں تو رسمی اندازِ تدریس سے قطع نظر کر کے یہ کوشش کی کہ اقبال کے دل میں فارسی ادب کا احترام پیدا ہو جائے اور نتیجہ اس ذوقِ سلیم کی تربیت ہو جس کے بغیر مطالعہ بالکل بیکار اور بے ثمر ہوتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا امہاتِ کُتبِ فارسی، شعری اور نثری ادب کے ذوق کی تربیت کے لیے نہایت مفید اساس کا کام دے سکتی ہیں اور جب ذوقِ ادب دل میں راسخ ہو جائے تو پھر شوقِ مطالعہ گوناگوں چمنستانوں اور سبزہ زاروں کی سیر کرا دیتا ہے۔ چنانچہ لابُد ہے کہ علامہ اقبال نے اکابرِ شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعہ کیا جن میں حافظ، عُرفی، نظیری، مولانا روم، عطار، سعدی، سنائی، صائب، بیدل، غالب، فغانی، فیضی وغیرہ شامل ہیں۔ بعض تذکرہ ہائے شعرائے فارسی جو اُس دَور میں بڑے مقبول تھے وہ اِس کے علاوہ ——— علامہ اقبال کے اشعار و مکتوبات

---

[1] شعرِ اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ ۶۵

میں ان سب شعرا کا بلکہ بعض ان کے علاوہ کا ذکر بھی کبھی عنواناً، کبھی ضمناً اور کبھی تضمیناً مل جاتا ہے۔

سر عبدالقادر کے بقول علامہ اقبال

"ابھی سکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا، پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے زمانہ میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کی۔"[1]

علامہ اقبال کی غزل گوئی سے سر عبدالقادر کی مراد اردو غزل گوئی ہے۔ اس لیے کہ دو سطروں کے بعد وہ علامہ اقبال کے حضرتِ داغ دہلوی سے خط و کتابت کرنے اور اپنی غزلوں پر اصلاح لینے کا ذکر کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے داغ دہلوی کو اپنی اردو غزلیں ہی بھیجی تھیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے فارسی میں کب شعر کہنے شروع کیے؟ میں نے ایک موقع پر بزرگوارم سید نذیر نیازی سے اس باب میں بات کی تو انھوں نے بڑے وثوق سے فرمایا کہ حضرتِ علامہ نے لاہور میں تشریف لانے سے قبل فارسی میں بھی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ بظاہر یہ معاملہ غیر ممکن نہیں اور سید نیازی غیر معتبر نہیں۔ تاہم کوئی سند اپنی نظر میں نہیں جس کی مدد سے بالتاکید کہا جا سکے

---

[1] دیباچہ بانگِ درا، صفحہ د، ذ

کہ علامہ اقبال نے فلاں سال یا فلاں سال کے ارد گرد فارسی میں شاعری شروع کی تھی۔

سر عبدالقادر نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری کے آغاز کو ان کے قیام انگلستان کے دَور کا واقعہ قرار دیا ہے۔ ان کا بیان ہے :

"مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے یہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں یا نہیں، انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ انھوں نے سوائے ایک آدھ شعر کہنے کے کبھی فارسی شعر کہنے کی کوشش نہیں کی، مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے، اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انھوں نے زبانی سنائیں، ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا جس کا پہلے انھوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اُردو شعر بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔" [1]

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے تھے اور ۱۹۰۸ء میں واپس آئے تھے،

---

[1] دیباچہ بانگ درا، صفحہ د، ز

سر عبدالقادر کے کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے انگلستان پہنچنے سے قبل فارسی میں ایک آدھ شعر کے سوا کبھی کچھ نہیں کہا ممکن ہے علامہ اقبال نے یہ بات از رہِ انکسار کہی ہو، یا شاید اس لیے کہی ہو کہ وہ اپنے فارسی اشعار سنانے کے لائق نہ جانتے تھے، ورنہ قصہ مختلف ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے اُن اشعار کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے انگلستان تشریف لے جانے سے قبل تحریر فرمائے مثلاً ۱۹۰۲ء میں انھوں نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجتماع کی تین نشستوں میں شرکت کی تھی اور نظمیں سنائی تھیں۔ تیسری نظم جو ۲۲ فروری کو اتوار کے دوسرے اجلاس میں سنائی اس کا عنوان تھا "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے"[1] اس نظم کے نو بند ہیں پہلے آٹھ بندوں میں ہر بند کا آخری شعر فارسی میں ہے، آخری یعنی نواں بند سارا فارسی میں ہے اور گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ جی چاہتا ہے کہ وہ گیارہ اشعار جو بطور نعت کہے گئے ہیں یہاں نقل کر دیے جائیں تاکہ اردو کی نظم کوہ ہمالہ اور سیرِ کہسار کے قریبی عہد میں لکھے جانے والے ان اشعارِ فارسی کو دیکھ کر کچھ اندازہ کیا جا سکے کہ علامہ اقبال کس سہولت اور صفائی سے فارسی میں شعر کہنے پر قادر تھے۔

بند نہم

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہٖ
سینہ ہا را از تجلّی یوسفستاں کردہٖ
اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہٖ

---

[1] باقیاتِ اقبال — از سید عبدالواحد معینی صفحہ ۹۸

اے کہ ذاتِ تو نہاں در پردہ عینِ عرب
رُوئے خود را در نقابِ میم پنہاں کردہ
اے کہ بعد از تو نبوّت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنورِ شمعِ عرفاں کردہ
اے کہ ہم نامِ خدا، بابِ دیارِ علمِ تو
امیّے بودی و حکمت را نمایاں کردہ
آتشِ الفت بداماںِ ربوبیّت زدی
عالمے را صورتِ آئینہ حیراں کردہ
فیضِ تو دشتِ عرب را مطلعِ انظار ساخت
خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ
گل فرستادن بہ بحرِ بیکراں می زیبدش
قطرۂ بے مایہ را ہم دستِ طوفاں کردہ
بے عمل را لطفِ تو لَا تَقْنَطُوْا آموز گشت
بس کہ وا بر ہر کسے بابِ دبستاں کردہ
ہاں دُعا کُن بہرِ ما اے مایۂ ایمانِ ما
پُرشود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

اسی سال یعنی ۱۹۰۲ء کی ایک اور نظم ہے۔ عنوان ہے "شکریۂ انگشتری"۔ مرتب "باقیاتِ اقبال" سید عبدالواحد معینی صفحہ ۱۳۱ پر رقمطراز ہیں کہ انھوں نے یہ نظم منشی سراج الدین صاحب میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کی بیاض سے لی ہے۔ یہ نظم

۲۳ اشعار پر مشتمل ہے مگر اُردو کے شعر فقط سات ہیں۔ باقی فارسی میں ہیں۔ فارسی زبان پر علامہ اقبال کو جو قدرت حاصل تھی اس اعتبار سے بھی اور اس اعتبار سے بھی کہ انگشتری کے حوالے سے مضامین کے کیا کیا نگینے تراشے گئے ہیں وہ سو شعر ہدیہ ناظرین ہیں' ـــ ہاں معینی صاحب نے صفحہ ۱۳۱ پر جہاں اپنا نوٹ درج کیا ہے وہاں علامہ اقبال کا خط بھی دے دیا ہے جو اس نظم کے ہمراہ ارسال ہوا تھا' ایک فقرہ یہ ہے" یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریہ میں عرض کرتا ہوں"ـــ بہر حال وہ اشعار یہ ہیں

یارم از کشمر فرستاد است چار انگشتری
چار در صورت بمعنی صد ہزار انگشتری
چار را گر صد ہزار آوردہ ام اینک دلیل
شد قبولِ دست یارم ہر چہار انگشتری
داغ داغ از موج مینا کاریش جوشِ بہار
میدہد چوں غنچۂ گل بوئے یار انگشتری
در لہانور[1] آمد و چشم تماشا شد تمام
بود در کشمیر چشم انتظار انگشتری
یار را ساغر بکف، انگشتری در دست یار
حلقہ اش خمیازۂ دستِ خمار انگشتری

---

[1] علامہ اقبال نے حاشیے میں تصریح کی ہے" لاہور کا دوسرا نام جس کو امیر خسرو قران السعدین میں استعمال کرتے ہیں۔"

ما اسیرِ حلقه اش او خود اسیر دست دوست
اللہ اللہ دام و صیاد و شکار انگشتری

خاتم دستِ سلیمانؑ حلقۂ درگوش وے است
اے عجب انگشتری را جاں نثار انگشتری

واہ چہ بکشاید بدستِ آں نگار سیم تن!
ماند گر زیں پیشتر سربستہ کار انگشتری

من دلِ گم گشتۂ خود را کجا جویم سُراغ
دزدیٔ دزدِ صفارا راز دار انگشتری

ہر دو باہم ساختند و نقدِ دل را می بُرند
پختہ مغز انگشتِ جاناں پختہ کار انگشتری

نو بہارِ دلفریب انگشتری در دست یار
بوسہ بر دستش زند لیل و نہار انگشتری

بوالہوس ز انگشتری طرزِ اطاعت یاد گیر
می نہد سر بر خطِ فرمانِ یار انگشتری

ماہِ نو قالب تہی کرد است از حسرت بچرخ
جلوہ فرما شد چو در انگشتِ یار انگشتری

ارمغانم سلکِ گوہر ہاست یعنی ایں غزل
کز سرانجم نُورہا آمد بہار انگشتری

گشت اے اقبال مقبولِ امیر ملک حسن
کز دو مارا گرہ آخر زکار انگشتری[1]

نظم دیکھ کر ناظرین کو فارسی شعرائے قصیدہ نگار کی نکتہ آرائیاں اور خیال آفرینیاں یاد آگئی ہوں گی، گویا اگر علامہ اقبال کو کسی ایسے ماحول سے واسطہ پڑ جاتا جس سے عرفی و نظیری کو پڑا تھا اور خدانخواستہ طبیعت گوارا کر لیتی تو میدانِ قصیدہ میں بھی قیامت ڈھاتے۔ مقصد یہ ہے کہ قدرتِ کلام اور اختراع کا جوہر جو قصیدہ نگار کے ہتھیار ہیں، علامہ اقبال کے پاس موجود تھے۔

ایک اور فارسی نظم کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے اس کا عنوان ہے "سپاس جناب امیرؑ"، یہ نظم جنوری ۱۹۰۵ء کے مخزن میں چھپی، جس کا مطلب ہے علامہ اقبال ابھی انگلستان نہیں گئے تھے، اس نظم پر مدیر مخزن کی جانب سے یہ الفاظ بطور وضاحت درج کیے گئے تھے " ذیل کی نظم درج کر کے ہم آج ان احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لیے اکثر دفعہ اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں، تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم بہ اظہارِ عقیدت شیخ صاحب (علامہ اقبال) صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں[2]" یہ نظم جنوری ۱۹۰۵ء میں چھپی، یہ معلوم نہیں لکھی کس سال میں گئی تھی ——— نظم چونتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ یہاں فقط پہلے چھ اور آخری چار شعر درج کیے جاتے ہیں۔

اے محو ثنائے تو زبانہا   اے یوسفِ کاروانِ جانہا

---

[1] آخری مصرع واضح نہیں، باقیات اقبال میں اسی طرح چھپا ہے کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے [2] باقیات اقبال ۱۹۲

اے بابِ مدینۂ محبّت　　اے نوحِ سفینۂ محبّت
اے ماحیٔ نقشِ باطلِ من　　اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِّ خط و جوب و امکاں　　تفسیرِ تو سُورہ ہائے قرآں!
اے مذہبِ عشق را نمازے　　اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سرِّ نبوّتِ محمدؐ
اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

خاکم بفرازِ عشق بُردی!　　زاں راز کہ بادلم سپردی
واصل بکنار، کشتیم شد　　طوفانِ جمال، زِشتیم شد
جُز عشق حکایتے ندارم　　پروائے ملامتے ندارم
از جلوہ عام بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

علّامہ اقبال کے جن فارسی اشعار کو یہاں درج کیا گیا ہے یا جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے ان کی تعداد پچیّس ہے اور بھی خدا جانے کتنے ایسے اشعار ہوں گے جو انھوں نے اس دور میں درج مکاتیب کیے ہوں گے یا تفنّنِ طبع کے طور پر کہے ہوں گے اور پھر انھیں بوجوہ شائع کرنے سے گریز کیا ہوگا جیسا کہ ان اشعار کے بارے میں خیال کیا جو ابھی ناظرین کی نظر سے گزرے۔

بہر طور محولہ بالا اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علّامہ اقبال کو فارسی شعر گوئی پر بھی شروع ہی سے تقریباً وہی قدرت حاصل تھی جو اُردو پر تھی ——— مصرعوں اور شعروں کے دروبست سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ اشعار

مشقّت کا ثمرہ ہیں اور مشقّت اس لیے لابد کہ یہ ابتدائی کوشش تھی ـــــــ یہ اشعار کسی طرح بھی ابتدائی نہیں معلوم ہوتے ورنہ وہ یوں ڈھلے ڈھلائے اور "کامل عیار" نہ ہوتے۔ اس اعتبار سے سید نذیر نیازی صاحب کا یہ کہنا کہ علّامہ اقبال نے سیالکوٹ کے دورِ طالب علمی ہی میں فارسی زبان میں بھی شعر کہنے شروع کر دیے تھے، بعید از قیاس نہیں دکھائی دیتا۔

رہا یہ کہ انگلستان میں جب علّامہ اقبال سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی تو گمان یہ ہے کہ اس مجلسِ احباب کی فضا تقاضائے غزل کر رہی تھی۔ اس وقت تک ممکن ہے فارسی میں غزل نہ کہی ہو اور اگر کہی ہو تو اُسے وہاں سنانے کے لائق نہ جانا ہو۔ اور پنڈ چھڑانے کے لیے کہہ دیا ہو کہ "میں نے فارسی میں ایک آدھ شعر ہی کہا ہوگا" ورنہ علّامہ اقبال کے اس بیان کو سر عبدالقادر کیوں تسلیم کر لیتے جو خود مخزن میں ان کے فارسی اشعار شائع کر چکے تھے۔ بہر حال اس واقعہ سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے بعض اوقات معاصر اہلِ قلم بلکہ قریبی احباب کی تصریحات بھی غلط فہمی پیدا کر دیتی ہیں اور چھان پھٹک چاہتی ہیں۔

سر عبدالقادر نے جن دو غزلوں کا ذکر کیا ہے کہ علّامہ اقبال نے انگلستان میں مذکورہ بالا دعوت کے بعد رات کے باقی حصے میں رقم کیں، معلوم نہیں وہ کون سی غزلیں تھیں کاش ان کا کوئی شعر درج ہو جاتا، تاہم ایک غزل ہمیں مل جاتی ہے جو علّامہ اقبال نے ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء کے مؤرخہ مکتوب میں عطیہ بیگم کے نام درج کی ہے، ہو سکتا ہے یہ غزل ان دو غزلوں میں سے ایک ہو، غزل کے جلو میں یہ عبارت ہے:

"میں اس خط کے ہمراہ ایک نظم بھیج رہا ہوں جس کے بھیجنے کا
میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا اور میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ
اسے غور سے پڑھیں گی اور اپنی تنقید سے مجھے مطلع کریں گی۔" [1]

اے گل زخارِ آرزو آزاد چوں رسیدۂ
تو ہم زخاک ایں چمن مانندِ ما دمیدۂ
اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ
دامن زسبزہ چیدۂ تا بفلک رسیدۂ
از لوحِ خویش باز پرس قصۂ جرعہائے ما
آخر جواب ناسزا از لب ما شنیدۂ
با من مگو کہ ہمچو گل ہموارہ شاخ بستہ باش
مانندِ موج بوئے مرا آوارہ آفریدۂ
ہنگامۂ دیر یک طرف شورش کعبہ یک طرف [2]
از آفرینشِ جہاں درد سرے خریدۂ
ہستیٔ ما گدائے تو یا تو گدائے ہستیٔ ما!
بہر نیاز سجدۂ در پس ما دویدۂ!
افتی اگر بدست ما حلقہ بگرد تو کشیم
ہنگامہ گرم کردۂ خود زمیاں رمیدۂ

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم، ترجمہ ضیاء الدین برنی، اقبال اکیڈیمی کراچی صفحہ ۸-۶۰
[2] یہ مصرع اسی طرح چھپا ہوا ہے۔

اقبالؔ غربتِ توام نشتر بدل ہمی زند
تو در ہجوم عالمے یک آشنا ندیدۂ

ہم اگر اس غزل کو پہلی غزل نہیں کہہ سکتے تو جب بھی اسے چند اوّلیں غزلوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس غزل کے اشعار جن مضامین کے حامل ہیں وہ علامہ اقبال کے ایک طرح سے مستقل موضوعات ہیں مثلاً خارِ آرزو، از لوحِ خویش باز پرس، تو گدائے ماستی، آفرینشِ جہاں دردِ سر، غربت یعنی احساسِ تنہائی، نیاز سجدہ پر ناز وغیرہ ــــــ غزل کی بحر میں بڑا ٹھہراؤ اور ترنّم ہے۔ بالِ جبریل کی غزلِ ذیل کا سا، جس کا مطلع ہے

ے گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

بلکہ زبورِ عجم" کی غزل ذیل کا سا بھی

ے فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را!
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

بہر حال جیسا کہ اُوپر بیان ہوا یہ غزل اپریل ۱۹۰۷ء کے مرقومہ ایک خط کا حصّہ ہے جب علّامہ اقبال یورپ میں تھے ــــــ ان کی یورپ سے واپسی ۱۹۰۸ء میں ہوئی اور پھر بقول سر عبدالقادر ان کی طبیعت کا رُجحان یا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد ان کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں اُردو نظمیں بھی ہوئیں اور اچھی اچھی، جن کی دھوم مچ گئی، یہ ٹھیک ہے کہ ان کی توجّہ کا مرکز اس دَور میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" رہی، "پیامِ مشرق" کی ترتیب بھی

اسی اثنا میں عمل میں آئی۔ لیکن ان کے باوصف اگر دیکھیں تو بانگِ درا کے تیسرے حصے میں شامل اشعار اسرار و رموز اور پیامِ مشرق کے سارے اشعار کے تقریباً برابر ہوں گے۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی کی جانب رُجحان کے وقفے طویل ہو جاتے رہے ہوں گے، سر عبدالقادر کہتے ہیں کہ اسرارِ خودی کا خیال دیر تک ان کے دماغ میں رہا۔ اور رفتہ رفتہ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر اُترنے لگا۔[1]

خود علامہ اقبال نے اپنے اس رجحان کی طرف ایک سے زیادہ بار اشارہ کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۱۱ء کا ایک مکتوب جو عطیہ بیگم کے نام ہے اور "اقبال اور عطیہ بیگم" اردو ترجمہ از برنی میں شامل ہے ان کے اردو سے ہٹ کر فارسی کی جانب راغب ہو جانے کی خبر دیتا ہے۔ اسی طرح ۱۸ جنوری ۱۹۱۵ء کا ایک خط جو مولانا گرامی کے نام ہے، اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ اس خط کے الفاظ یہ ہیں :

> "اردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہو جاتا ہوں، فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ دل کا بخار اردو میں نکال نہیں سکتا۔"[2]

اسی خط میں آگے چل کر علامہ اقبال نے اسرارِ خودی کے مکمل ہو جانے کی خبر دی ہے لکھا ہے :

> "مثنوی ختم ہو گئی ہے، آپ تشریف لائیں، تو آپ کو دکھا کر اس کی اشاعت کا اہتمام کروں۔"

ایک فارسی غزل بھی اس خط میں شامل ہے۔ اور وہ یہ ہے :

---

[1] دیباچہ بانگِ درا صفحہ ن

[2] مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۹۹

بیار بادہ کہ گردوں بکام ما گردید!
مثالِ غنچہ نواہا ز شاخسار دمید

خورم بیاد تنک نوشیٔ امامِ حرم
کہ جز بصحبتِ یارانِ نکتہ داں نچشید

چناں ز نقشِ دوئی شست لوحِ خاطرِ خویش
کہ وحشیٔ توہم از آہوئے خیال رمید

فزوں قبیلۂ آں پختہ کار باد کہ گفت
چراغِ راہِ حیات است جلوۂ اُمید!

نواز حوصلۂ دوستاں بلند تر است
غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نشنید

توہم ز آتشِ اقبال شعلۂ بردار
کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید

علّامہ اقبال اور خواجہ شیراز

مرتب "مکاتیب اقبال بنام گرامی" جناب محمد عبداللہ قریشی نے صفحہ ۱۰۱ پر صراحت کی ہے کہ اقبال نے جو غزل گرامی کو ارسال کی (جس کے اندراج پر سابق باب بند ہوا) وہ "پیام مشرق" میں شامل ہو چکی ہے۔ اور یہ ۱۹۰۷ء والی غزل کے بعد گویا اولین یا اولین میں سے ایک ہے۔ اس غزل میں تیسرا شعر ـ

چناں ز نقش دوئی شست لوحِ خاطرِ خویش
کہ وحشیٔ تو ہم از آہوئے خیال رمید!

حذف کر دیا گیا ہے اور مقطعے سے پہلے شعر ذیل کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

؎ عیارِ معرفت مشتری است جنسِ سخن!
خوشم از انکہ متاعِ مرا کسے نخرید

مقطعے کا پہلا مصرعہ

" تو ہم ز آتش اقبال شعلہ بردار"

کو تبدیل کر کے اس طرح بنا دیا گیا ہے۔

" ز شعر دلکش اقبال می تواں دریافت"

یہ غزل "پیامِ مشرق" کے صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵ کی زینت ہے اور یہ ۱۹۰۷ء میں
میں کہی جانے والی مذکورۃ الصدر غزل " اے گل ز خار آرزو آزاد چوں رسیدۂ "
کے بعد کے اولین غزل معلوم ہوتی ہے ـــــــ یہ خواجہ شیراز حضرتِ حافظ کی
غزل کے تتبع میں ہے ۔ جس کا مطلع ہے ؎

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید !
نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید !

مقطع ہے ؎

مرو بخواب کہ حافظ ببارگاہِ قبول !
ز وردِ نیم شب و درس صبح گاہ رسید !

حافظ کی یہ غزل ۷۸۶ھ کے بعد کی ہے ۔ اس سال شاہ شجاع نے رحلت
کی تھی اور منصور شیراز پر قابض ہوا تھا ۔ حافظ کا سال ارتحال مولانا جامی کے بقول
۷۹۲ھ قرار پاتا ہے ـــــــ اس اعتبار سے یہ غزل حافظ کی زندگی کے آخری سالوں
سے تعلق رکھتی ہے ـــــــ اور علامہ اقبال کی یہ غزل عین اسی دور میں حافظ کے تتبع
میں کہی جا رہی تھی ۔ جب اسرار خودی پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی تھی اور جس کے دیباچے میں
علامہ اقبال نے حافظ کی شاعری کو جام حشیش قرار دیا تھا ۔

؎ بگذر از جامش کہ در مینائے خویش
چوں مریدانِ حسن دارد حشیش !

۲۸ جنوری ۱۹۱۵ء کو علامہ اقبال نے ایک اور خط مولانا گرامی کو لکھا یعنی
مذکورہ مکتوبات سے فقط دس روز بعد جس میں رقمطراز ہوئے :۔

"ہاں چند اشعار اور لکھتا ہوں۔ اس خیال سے نہیں کہ اپنے شعر سناؤں بلکہ اس خیال سے کہ شاید آپ کو تحریک ہو اور آپ سے نئے اشعار سنوں"۔

اور وہ شعر یہ ہیں :

خوش آنکہ رخت خرد را ز شعلۂ مے سوخت
مثالِ لالہ متاعے ز آتشے اندوخت

دلم تپید ز محرومیٔ فقیہہ حرم!
کہ پیر میکدہ جامے بفتوئی نفروخت!

مسنج قدر سرود از نوائے بے اثرم!
ز برق نغمہ تواں حاصل سکندر سوخت

تو ہم ز ساغرِ مے چہرہ را گلستاں کن!
بہار خرقہ فروشی بہ صوفیاں آموخت

عجب مدار ز سرمستیم کہ پیر مغاں!
قبائے رندیٔ حافظ بہ قامت من دوخت

صبا بمولدِ حافظ سلام ما برساں!
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

یہی غزل علامہ اقبال نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں جو مہاراجہ سر کشن پرشاد کے نام تھا، درج کی تھی، اور بتایا تھا کہ یہ تازہ غزل ہے :

ان تعطیلوں میں چند فارسی اشعار نظم ہو گئے تھے، اگر پسند ہوں تو تزکِ عثمانیہ میں طبع فرمائیے"۔ [1]

گویا مولانا کے پاس پہنچنے سے قبل یہ اشعار مہاراجہ صاحب موصوف کی نظر سے گزر چکے تھے، جب مولانا گرامی کو ارسال ہوئے تو لفظاً ان میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی، ہاں مطلع اور مقطع کو چھوڑ کر باقی اشعار کی ترتیب بدل دی گئی۔ یہ غزل بھی پیامِ مشرق میں شامل ہے۔ مگر کئی دلچسپ تبدیلیوں کے ساتھ۔ گرامی کے یہاں پہنچنے والی غزل کے آخری دونوں شعر حافظ کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عجب مدار ز سرمستیم کہ پیرِ مغاں
قبائے رندیٔ حافظ بقامتِ من دوخت

صبا بمولدِ حافظ سلامِ ما برساں!
کہ چشمِ نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

ایک تو اپنی سرمستی کے کیف کو رندیٔ حافظ سے منسوب کیا ہے اور دوم شیراز کے حضور سلام ادب بھیجا ہے۔ وہ شیراز جسے نکتہ دروں کی چشم نے اپنی ضیا پاشیوں سے فروزاں رکھا۔ اور ظاہر ہے کہ خواجہ حافظؒ شیراز کی سب سے اہم شمع ہیں مگر پیامِ مشرق میں درج کرتے وقت سرمستی و رندی والا شعر حذف کر دیا گیا اور مولدِ حافظ کو گلشن ویر بنا دیا گیا۔ "فتوی نفروخت" والے شعر میں فقیہہ بزرگ کی جگہ فقیہہ حرم کر دیا گیا۔

جب یہ غزل کہی گئی اس وقت اسرارِ خودی زیرِ تصنیف تھی جس کے دیباچے میں کلامِ حافظ کو حسن بن صبّاح کے ہاتھوں پلائی جانے والی حشیش قرار دیا گیا تھا۔ ایک ہی دَور میں ایک جانب مدح ہے۔ اور ایک جانب قدح، رہا مولدِ حافظ کو گلشن ویر بنانا

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم صہ ۲۱۰

تو عیاں ہے کہ پیامِ مشرق کو گوئٹے کے دیوانِ مغربی کے جواب کی حیثیت حاصل تھی لہٰذا اس کے تولد کی تاریخ بجا نہیں مگر کیا مولدِ حافظ کو محو کر کے ہی یہ فرض ادا ہو سکتا تھا؟ کسی بھی غزل میں یہ گنجائش پیدا کی جا سکتی تھی۔

اصل میں اسرارِ خودی اور پیامِ مشرق کی اشاعت کے مابین نو دس سال کا عرصہ حائل تھا۔ اور اس وقت تک خواجہ حافظ کے باب میں کئی کئی معرکے وجود میں آ چکے تھے اور حافظ کے مدافعین نے علامہ اقبال کو ایک طرح سے مخالفِ حافظ کی پوزیشن قبول کر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ مخالفت الفاظ و بیانِ حافظ کے ظاہری معانی کے مسکر اثرات کی تھی نہ کہ تمام تر حافظ کی، تاہم اسرارِ خودی کے تمہیدی اشعار میں حافظ کے خلاف جن شدید جذبات کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پیامِ مشرق میں ایسے عقیدت مندانہ اشعار کا اندراج کھلا تضاد ہوتا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اس طرح کی تبدیلیوں سے اس تضاد کو ایک حد تک ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ [۱]

بہرحال علامہ اقبال کے انگلستان سے واپس تشریف لانے کے بعد کہی جانے والی یہ تقریباً اوّلیں غزلیں حافظ کے تتبع میں ہیں۔ حافظ کے رنگ اور اسلوب سے متاثر ہیں اور حافظ کے حضور ایک طرح کے خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتی ہیں ———

پھر جب "پیامِ مشرق" کے حصۂ غزل کو جس کا عنوان "مے باقی" ہے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اوّلیں غزل یہ ہے (خود "مے باقی" بھی حافظ ہی کا عطیہ ہے یعنی "بدہ ساقی مے باقی کہ

---

[۱] اسرارِ خودی اور حافظ کے باب میں برپا ہونے والے معرکے کی تفصیل ان مقالوں میں دیکھئے جو محمد عبداللہ قریشی صاحب نے رسالہ اقبال میں شائع کئے۔

در جنّت نخواہی یافت")

بہار تا بہ گلستاں کشید بزمِ سرود
نوائے بلبلِ شوریدہ چشمِ غنچہ کشود

گماں مبر کہ سرشتند در ازل گِلِ ما !
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیرِ وجود !!

بہ علم غرّہ مشو کارِ مے کشی دگر است
فقیہِ شہر گریبان و آستیں آلود

بہار برگ پراگندہ را بہم بربست
نگاہِ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

نظر بخویش فروبستہ را نشاں ایں است
دگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیرِ زندہ دلے
بہر زمانہ خلیل است و آتشِ نمرود

چہ نقشہا کہ نہ بستم بکارگاہِ حیات !
چہ رفتنی کہ نہ رفت و چہ بودنی کہ نبود

بہ دیریاں سخنِ نرم گو کہ عشق غیور !
بنائے میکدہ افگند در دلِ محمود

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

ظاہر ہے کہ یہ غزل حافظ کی اس غزل کے تتبع میں ہے جس کا مطلع ہے:

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

پیام مشرق کی دوسری غزل کا مطلع دیکھئے:

حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبراں زہرہ وشاں گلبدناں سیم براں

یہ غزل بھی حافظ کی غزل کے تتبع میں ہے، اسلوب وہی ہے البتہ ردی بدل دی گئی ہے حافظ کی غزل ہے:

شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں
کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں

بر جہاں تکیہ مکن ور قدحے مے داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خور و نازک بدناں

باصبا در چمن لالہ سحر میگفتم!
کہ شہیدانِ کہ اند ایں ہمہ خونیں کفناں

اس تیسرے شعر کے مقابل علامہ اقبال کا یہ شعر دیکھئے:

در چمن قافلہ لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمدہ اند ایں ہمہ خونیں جگراں

اسی طرح علامہ اقبال کی غزل ذیل پر نگاہ ڈالیے:

از ما بگو سلامے آں ترک تند خو را
کاتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را!

ایں نکتہ را شناسد آں دل کہ دردمنداست
من گرچہ توبہ کردم نشکستہ ام سبو را

اے بلبل از وفائش صد بار باتو گفتم
تو در کنار گیری باز ایں رمیدہ بو را

رمز حیات جوئی جز در تپش نیابی!!
در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی!
درماں نیافریدی آزار جستجو را

گفتی مجو وصالم بالاتر از خیالم
عذرِ نو آفریدی اشکِ بہانہ جو را

از نالہ بر گلستاں آشوب محشر آور!
تا دم بسینہ پیچد مرغانِ ہائے وہو را

غزل کی بحر ہے:

ع دل می رود زدستم صاحب دلاں خدا را

اور دوسرا، تیسرا اور پانچواں شعر اسی غزل حافظ کی فضا کا ہے ـــــ مطلع بالصراحت حافظ کے ایک اور مطلعے کی یاد تازہ کر رہا ہے اور وہ یہ ہے۔

ے صبا بلطفِ بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ ما را!

"رمزِ حیات جوئی؟ گفتی مجو، عالم آز نالۂ برگلستاں" والے اشعار میں آہنگ تو حافظ ہی کا ہے مگر علامہ اقبال کے تفلسف، سخت کوشی اور محشر آفرینی کی روح حاوی ہے چنانچہ من و تو کا امتیاز لازماً باقی رہ جاتا ہے۔

اسی ضمن میں علامہ اقبال کی وہ غزل بھی دیکھ لی جانی چاہیئے۔ جس کا مطلع ہے

" قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند!
زشاہ تاج ستانند و خرقہ می پوشند!

یہ پوری غزل علامہ اقبال کی چند نمائندہ ترین غزلوں میں سے ہے مگر کلمات، تراکیب اور آہنگ خواجہ حافظ کا ہے ——— حق یہ ہے کہ حافظ کے حسنِ بیان حسن اختراع، حسنِ تراکیب اور حسن آہنگ کا اثر علامہ اقبال پر تمام عمر رہا۔ حافظ کے فقر و مستی اور درویشی و بے نیازی کے مضامین بھی نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوصف علامہ اقبال کے دل و دماغ پر مستقل اثرات چھوڑ گئے۔ عطیہ بیگم نے ۱۹۰۷ء کی ایک ملاقات کے بارے میں جو علامہ اقبال کے ساتھ انگلستان میں ہوئی تھی ذیل کی یادداشت رقم کی ہے:

" دورانِ گفتگو میں حافظ کا ذکر آگیا اور چونکہ میں خود اس شاعرِ اعظم سے دلچسپی رکھتی تھی اس لئے میں نے ان کے بہت سے برمحل اشعار سنائے میں نے اندازہ لگایا کہ خود اقبال بھی حافظ کے بے حد مدّاح ہیں، انہوں نے کہا" میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اس وقت ان کی رُوح مجھ میں حلول کرجاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گم ہوجاتی ہے اور میں خود

حافظ بن جاتا ہوں"[1]

اس اعتبار سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی یہ رائے حقیقت سے کوئی زیادہ بعید نہیں معلوم ہوتی کہ

"اقبال کی کئی فارسی غزلیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو دیوانِ حافظ میں داخل کر دیا جائے تو پڑھنے والے حافظ کے کلام سے ان کا امتیاز نہ کر سکیں"[2]

میں خلیفہ صاحب کے بیان میں اتنی تبدیلی ضرور چاہوں گا کہ کئی فارسی غزلیں ایسی ہیں جن کے بیشتر اشعار کو دیوان حافظ میں شامل کیا جاسکتا ہے، پوری کی پوری غزلیں دیوانِ حافظ میں نہیں سما سکتیں۔ اس لئے کہ شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جو ایک آدھ خالص "اقبالی" مضامین کی مالک نہ ہو۔

وقت کے ساتھ ساتھ حافظ کے رنگ میں ہونے کی کیفیت میں تبدیلی واقع ہوتی رہی مگر بقول نظیری

ع : بوئے مے باقی بود گر بشکنی پیمانہ را

یہاں علامہ اقبال کے "Stray Reflections" کے جملہ ذیل کا اندراج ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں انہوں نے حافظ کے فن پر ایسے نازک اور لطیف پیرائے میں تحسین کہی ہے کہ ان کا ترجمہ کرنا بے ادبی محسوس ہو رہا ہے۔

In Words like cut Jewels Hafiz put the Deconscious

---

[1] عطیہ بیگم، ترجمہ ازبرنی، اقبال اکیڈیمی، کراچی صفحہ نمبر ۱۱-۱۰ [2] فکر اقبال صفحہ ۳۰۴

ل "Spirituality of the Nightingale"

یہ جملہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔ اب "ضربِ کلیم" کے یہ شعر دیکھئے، ظاہر ہے کہ حافظ کے فن پر ان کی یہ رائے ان کی عمر کے آخری دو تین سالوں سے تعلق رکھتی ہے۔ تین شعر کی نظم ہے عنوان ہے "ایجادِ معانی" ——— مضمون ہے :

"قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل"

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد

خونِ رگِ مزدور کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

۱۸، جنوری ۱۹۱۵ء والے مکتوب بنام گرامی کا ذکر گزر چکا ہے اس خط میں انہوں نے مولانا گرامی کی ایک غزل پر زوروں کی داد دی تھی ——— وہ غزلِ گرامی، خواجہ حافظ کی غزل کے اتباع میں تھی۔ گرامی کا مطلع یہ تھا۔

اسیرِ گوشۂ چشمِ تو شہسوارانند !
شہیدِ نیم نگاہِ تو شہریارانند !

شعرِ ذیل کو بالخصوص سراہا ہے۔

ل "Stray Reflections" صفحہ ۱۱۹

~ ز دیدہ تا درِ دل ذرہ ذرہ غمازاست !
گماں مبر کہ دل و دیدہ راز دار انند !

اور لکھا ہے :

"سبحان اللہ، کیا بات پیدا کی ہے، حافظ کی روح گرامی کو دُعا
دیتی ہوگی، تمام غزل مرصّع ہے، جزاک اللہ۔"

اسی طرح ۲۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا گرامی کو لکھا۔ "ظہور مُصطفویؐ والا شعر آپ نے پسند فرمایا۔ نظیری کی غزل اس پر خوب ہے مگر خواجہ حافظ کی غزل سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ اگر اس زمین میں آپ پہلے نہیں لکھ چکے تو ضرور لکھیے اور جو شعر ہوں خط میں تحریر فرمائیے [1]

یہ ظہور مصطفویؐ والا اشارہ خود علامہ اقبال کی اپنی غزل کی طرف ہے، جس کا مطلع ہے

~ بشاخِ زندگی مانمی بہ تشنہ لبیست !
تلاشِ چشمہ حیواں دلیل کم طلبیست !

اور ظہور مصطفویؐ والا شعر جس کی مولانا گرامی نے بطور خاص داد دی یہ ہے

~ نہالِ ترک زبرقِ فرنگ بار آورد !
ظہور مُصطفویؐ را بہانہ بولہبی است

اس شعر میں جنگ عظیم اوّل میں ترکوں کے ڈوب کر اُبھرنے کی جانب اشارہ

---

[1] مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۱۸۰

ہے ـــــــ قدیم کلاسیکی رنگ میں اپنے دور کے اہم ملی مسائل و واقعات کی جانب کتنا بلیغ اشارہ ہے۔ یورپ کو بوبھی قرار دیا ہے بمصطفوی کی بلاغت واضح ہے۔

نپولین نے یورپ کا امن تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ افراتفری کا عالم تھا ریاستیں برباد ہو رہی تھیں، نئے غاصب پرانے غاصبوں کی جگہ لے رہے تھے۔ اس عالم میں گوئٹے کو حافظ کی آغوشِ راحت میں تسکین کی جستجو ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے لکھا۔

"میں مشرق کی دنیا میں جہاں کبوتریاں غٹ غٹ کر رہی ہوں میکدوں کی دیواروں کے سائے میں چاہتا ہوں اے حافظ کہ تیرا ذکر کروں، کیفیت یہ ہو کہ میری محبوبہ نے رخسار سے نقاب اٹھا رکھی ہو اور اس کی عنبر بار زلفوں کی خوشبو چار سُو پھوٹ رہی ہو۔"[1]

امرتسر اور لاہور وغیرہ شہروں میں جب ۱۹۱۹ء والا مارشل لا، نافذ ہوا تو علامہ اقبال نے بھی شعر حافظ میں سامانِ تسکین تلاش کیا۔ چنانچہ وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو تحریر کرتے ہیں:

"آج آٹھ دن سے مارشل لا یعنی قانونِ عسکری جاری ہے۔ پنجاب کے بعض دیگر اضلاع میں بھی گورنمنٹ یہی قانون جاری کرنے پر مجبور ہو گئی[2]۔ جن لوگوں نے قصور اور امرتسر میں قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان پر مقدمات

---

[1] الشرق والاسلام فی جرنتہ۔ از عبدالرحمٰن صدقی (ادارہ العامۃ للثقافۃ صفحہ ۹۵ ثقافہ قاہرہ

[2] مجبور ہو گئی ہے کی مجبوری واضح ہے۔

چلاتے گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے۔ مگر خواجہ حافظ کا شعر "تسکین" کا باعث ہے ؎

ہاں مشو نومید چوں واقف نہ از سرِ غیب
باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور[1]

ایسی اور کئی مثالیں ہیں کہ علامہ اقبال نے حضرت حافظ کو اسرارِ خودی کی اشاعت سے قبل بھی اور بعد بھی زوروں کی داد دی۔ اختلاف کی بنا مختلف تھی - اور وہ خواجہ حافظ کے اشعار کا صلح المزاج اور زوال پذیر افرادِ معاشرہ کے قلوب و اذہان پہ منفی اثر تھا۔ عوام عموماً ظاہر پرست واقع ہوتے ہیں وہ رمز و ایما کی گہرائیوں میں اترنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ لہذا اکثر اوقات وہ شاعر کے اصل مقصود سے دور جا پڑتے ہیں۔ علامہ اقبال نے قوم میں مقاومت کی روح پیدا کرنی چاہی اور جلترنگ کے بدلے لہو ترنگ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ وہ زجاج کو حریف سنگ بنانا چاہتے تھے۔ ایسے عالم میں خانقاہوں اور زاویوں میں اور ممبروں پر خواجہ کے ایسے خاص اشعار کی تلحین اور قوالی جو حالات سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دینے کے بجائے حالات سے سازباز کرنے اور قانع ہو رہنے کی ترغیب دیں علامہ اقبال کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ——— اس ضمن میں علامہ اقبال کی اپنی وضاحت ملاحظہ ہو۔

"... لیکن فردی اور ملی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ میرے نزدیک وہ معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۹۲

اشعار اغراضِ زندگی میں ممد ہیں تو وہ شاعر اچھا ہے اور اگر اس کے اشعار زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے . . . ۔ مختصراً یہ کہ وہ (حافظ) ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراض زندگی کے لئے مضر ہے ۔ [1]

میرے خیال میں اس امر میں کچھ ان لوگوں کا اپنا بھی قصور ہے جو اپنی طبع کے میلان سے مخصوص انتخاب کرتے ہیں اور پھر گنگناتے گاتے ہیں ۔ ورنہ دیوان حافظ میں زندگی آموز اور انقلاب آفریں غزلیں بھی ہیں ـــــــ پھر یہ کہ خواجہ حافظ نے کونسی غزل کس عمر میں کہی ، کس کیفیت میں کہی ، اس کا سیاسی پس منظر کیا تھا ، رمز و ایما کے عقب میں کیا قیامت کارفرما تھی ، لہجہ مثبت ہے یا طنزیہ ؟ اپنی عیش کوشی کے مضامین کے پردے میں کسی حکمران یا حکمران ٹولے پر تعریض تو نہیں ' وغیرہ وغیرہ اس دھندے اور جھنجھٹ میں کون پڑتا ، طنزیہ لہجے میں شعر پڑھا جائے تو معانی معکوس ہو جاتے ہیں ، یہ چھان پھٹک کون کرتا اور ستم بالائے ستم یہ کہ حافظ کی غزلوں کے اردگرد کوئی اور شے نہیں جو قاری کو ظاہر سے باطن کی جانب لے جائے ۔ مثلاً اگر خواجہ حافظ کے ملفوظات قلمبند ہوئے ہوتے ' مکاتیب اگر تھے تو مرتب ہوئے ہوتے اگر ان کے مفصل سوانح حیات لکھے گئے ہوتے ۔ حافظ نے مولانا روم کی طرح کوئی مثنوئ معنوی ترتیب دی ہوتی ، سعدی کی طرح کوئی بوستاں تصنیف فرمائی ہوتی ، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مولانا روم کی غزلیں جب رقص شراب ' شاہد سرمستی

---

[1] مقالات اقبال ۔ ترتیب سید عبدالواحد معینی ، شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور صفحہ نمبر ۱۶۷ - ۱۶۶

جذب کے مضامین پیش کرتی ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ مصنف وہ ہیں جنہوں نے زبانِ پہلوی میں قرآن تصنیف کیا ہے۔ لہذا ہم شراب، ساقی، میخانہ، مغبچہ، رنگ آہنگ، بہار، عشق وغیرہ کے مطالب پنہاں کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔ مگر خواجہ حافظ کے دیوان غزلیات کے اور کچھ نہیں [1]

اس ضمن میں استاذی ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی صراحت بڑی متوازن اور مفید ہے۔

" انصاف یہ کہتا ہے کہ رمزی پیرایۂ بیان کا جو حق صوفی شاعروں بلکہ سبھی شاعروں کو دے دیا جاتا ہے اس سے حافظ کو خاص طور سے کیوں محروم رکھا جائے؟ اور بادہ و جام کی یہ رمزیت تو خود حکیم مشرق (علامہ اقبال) کے کلام میں موجود ہے۔ بقول غالب مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی ہو تو شاعری کا مزا تب ہی آتا ہے کہ بات بادۂ و ساغر کی اصطلاحوں میں کی جائے۔ جب یہ رعایت ادب میں اور دوسرے لوگوں کو مل چکی ہے تو اس بے چارے حافظ کو کیوں مستثنیٰ کیا جائے" [2]

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کی رائے کی تائید میں خود علامہ اقبال کا اپنا شعر ذیل دلیل بھی ہے اور معذرت بھی۔

---

[1] راقم الحروف نے "مطالعہ کلام حافظ" مشمولہ "صحیفہ لاہور" ادبیات فارسی نمبر" میں بھی اس امر پہ بحث کی ہے۔

[2] اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے مشمولہ مقاماتِ اقبال صفحہ نمبر ٦٧

ے برہنہ حرف نگفتن کمال گویا نیست !
حدیثِ خلوتیاں جُز بہ رمز و ایما نیست

ویسے ایک بات بہرحال صاف ہو جانی چاہیئے۔ وہ یہ کہ علامہ اقبال اگرچہ رمز و ایمائ کے شاعرانہ حقوق تسلیم کرتے تھے۔ اور خود بھی رمز و ایما سے بھرپور کام لیتے تھے۔ تاہم وہ حافظ کے صوفی ہونے کے قائل نہ تھے۔ مولانا جامی خواجہ حافظ کے قریب العصر بزرگ صوفی اور شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے خواجہ حافظ کو نفحات الانس میں "لسان الغیب" اور "ترجمانِ اسرار" قرار دیا ہے اور مزید فرمایا ہے کہ

"ایک بزرگ خواجگان قدس اللہ اسرارہم کے سلسلہ میں سے فرماتے ہیں کہ اگر مرد صوفی ہے تو کوئی دیوان دیوانِ حافظ سے بہتر نہیں"[1]

علامہ اقبال نے "اگر مرد صوفی ہے" کو جو ترجمہ ہے "شرط آنکہ مرد صوفی باشد" کا ان معنوں میں لیا ہے کہ بشرطیکہ کہنے والا یعنی شاعر صوفی ہو۔ چنانچہ وہ مولانا جامی کی رائے کو بڑی معتدل رائے قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر رمز اشعار میں موجود ہے تو پھر شاعر کے واقعی صوفی ہونے یا نہ ہونے سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ اور اگر مولانا جامی کا مفہوم وہی ہوتا جو علامہ اقبال کے یہاں ہے تو وہ حافظ کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کے لقب سے کیوں یاد کرتے۔ علامہ اقبال ان القاب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

اسی طرح حضرت اشرف جہانگیر سمنانی رح کی خواجہ حافظ کے بارے میں تصریحات

---

[1] نفحات الانس اردو ترجمہ صفحہ ۶۴۹

کو بھی رد کر دینے کی جانب مائل نظر آتے ہیں ـــــ اپنے مکتوبات مورخہ جولائی ۱۹۱۶ء میں جو مولوی سراج الدین پال صاحب کے نام ہے لکھتے ہیں۔ "مولانا جامی کی نفحات الانس بھی ملاحظہ کیجیے۔ اور غور سے دیکھئے کہ مولانا نے کس قدر احتیاط سے حافظ کے متعلق لکھا ہے۔ پڑھنے پر آپ کو خود بخود یہ بات معلوم ہو جائے گی ـــــ خواجہ حافظ صاحب کے متعلق ایک معاصرانہ شہادت ملفوظات شاہ جہانگیر اشرف میں پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب کمیاب ہے مگر معلوم نہیں کہ یہ ملفوظات کس نے جمع کئے اور شاہ جہانگیر اشرف کی وفات کے کس قدر عرصے بعد' شاہ جہانگیر اشرف' حافظ کو ولیؒ کامل تصور کرتے تھے اور وہ حافظ سے ہم صحبت رہے ہیں۔ اس کے متعلق بھی جستجو کر رہا ہوں۔" آگے فرماتے ہیں۔ "تصوف کا پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں "فصوص الحکم" کی تعلیمات کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں' اس پر انشاء اللہ مفصل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے)۔۔۔۔[1]

بین القوسین "اگر اسے صوفی سمجھا جائے" لکھ کر علاّمہ اقبال نے اپنے میلان بلکہ رجحان کا اظہار کر دیا جائے یعنی وہ حافظ کو صوفی ماننے پر آمادہ نہیں، رہا حضرت شاہ جہانگیر اشرف سمنانی کے ملفوظات کا معاملہ تو یہاں بھی علاّمہ اقبال کی تمنّا یہی نظر آتی ہے کہ ان ملفوظات کو کسی طرح غیر معتبر قرار دیا جائے۔ بجا، لیکن ان مکتوبات کا کیا کیا جائے جن میں وہ خط بھی شامل ہے جس میں حضرت شاہ جہانگیر اشرف نے

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۴۴-۴۳

حضرت حافظ کو "یکے از مجذوبان درگاہ الٰہی اور یکے از محبوبانِ بارگاہِ متعالی بتایا ہے"[1]

اس سب کچھ کے باوجود جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے۔ علامہ اقبال کی غزل باعتبار رنگ و آہنگ جس قدر خواجہ حافظ کی غزل کے قریب ہے۔ اس قدر کسی اور فارسی شاعر کی غزل کے قریب نہیں۔ خواجہ حافظ کے بعد سب سے زیادہ اثر نظیری کا دکھائی دیتا ہے اور نظیری خود مقلدِ حافظ تھا۔ جناب مظاہر مصفا کے الفاظ ہیں۔

"نظیری کاملاً تحتِ تاثیر غزل سرائی حافظ شیراز بود"[2]

نظیری کے بعد مولانا روم کی باری آتی ہے ازاں بعد دیگر شعرائے فارسی، آئندہ صفحات میں اکابر شعرائے فارسی کی ان غزلوں کا ذکر کر دیا جائے گا۔ جن کا اتباع میں علامہ اقبال نے غزلیں کہیں، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال فارسی کی کلاسیکی روایت سے کس قدر آگاہ تھے اور کس درجہ متاثر تھے۔ نیز یہ کہ فن کی جس سطح پر شعر فارسی کی دنیا کے اکابر و اعاظم کھڑے تھے۔ علامہ اقبال ان کے روبرو کس حیثیت کے مالک دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ قارئین پر واضح ہو جائے گا۔ کلاسیکی غزل کی روایت کی رو سے علامہ اقبال کی فارسی غزل بڑی بلند مقام ہے

ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہر دور کے کچھ مخصوص تقاضے ہیں جو شاعر اپنے معاصر تقاضوں کو جانتا ہے اور ان کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اپنے دور میں جدید کہلاتا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں جدید و قدیم کی بحث ملاحظہ ہو۔

---

[1] ملاحظہ ہو، مکاتیب حضرت جہانگیر اشرف قلمی نسخہ "معارج الولایۃ" پنجاب یونیورسٹی، لاہور

[2] دیوان نظیری نیشاپوری کتاب خانۂ امیر کبیر زوّار، طہران، ص ۴۲۱

"میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو جانتا ہوں، شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کے لئے پُر اثر الفاظ تلاش کرے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصور ہو سکتا ہے نہ کہ نفسِ شعری ..." [1]

سب سے پہلے ہم خواجہ حافظ اور علّامہ اقبال کی ہم زمین اور ہم طرح غزلیں دیکھتے ہیں۔ اُن کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہے۔ ان میں وہ غزلیں شامل نہیں جو حافظ کے قوافی میں تو نہیں مگر اُن کے رنگ اور اسلوب میں کہی گئی ہیں جیسا کہ ایک آدھ غزل کے باب میں قبل ازیں صراحت کی جا چکی ہے۔

حافظ ؎ کنوں کہ در چمن آمد گُل از عدم بوجود
بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود

علّامہ اقبال ؎ بہار تا بہ گلستاں کشید بزمِ سرود
نوائے بلبلِ شوریدہ چشمِ غنچہ کشود

(پیامِ مشرق ۱۶۷)

حافظ ؎ سرم خوش است و بہ بانگِ بلند می گویم!
کہ من نسیمِ حیات از پیالہ می جویم!

---

[1] اقبال نامہ حصّہ اول ص ۲۸۰

علامہ اقبال ؎ بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم!
غزل سرائم و پیغام آشنا گویم!
(پیام مشرق ۱۷۳)

حافظ ؎ جہاں بر ابروئے عید از ہلال وسمہ کشید
ہلال عید در ابروئے یار باید دید!
علامہ اقبال ؎ بیار بادہ کہ گردوں بکام ما گردید
مثال غنچہ نواہا ز شاخسار دمید
(پیام مشرق ۱۸۴)

حافظ ؎ شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں!
کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
علامہ اقبال ؎ حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں!
(بہ تبدیل قافیہ) دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں
(پیام مشرق ۱۹۹)

حافظ ؎ اگرچہ عرض ہنر پیش یار بی ادبیست
زباں خموش ولیکن دہاں پر از عربیست
علامہ اقبال ؎ بشاخ زندگی مانمی ز تشنہ لبیست!
تلاش چشمۂ حیواں دلیل کم طلبیست!
(پیام مشرق ۱۹۶)

حافظ؎ دلم رمیدہ لولی وشیست شور انگیز!
دروغ وعدہ و قتال وضع و رنگ آمیز
علامہ اقبال؎ دلیل منزل شوقم بد امنم آویز!
شررز آتش نابم بخاک خویش آمیز

(پیام مشرق - ۲۰۲)

حافظ؎ نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
علامہ اقبال؎ جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند
ہمیں بس است کہ آئینِ چاکری داند

(پیام مشرق ۲۱۰)

حافظ؎ سحرم ہاتفِ میخانہ بدولت خواہی!
گفت باز آئی کہ دیرینۂ ایں درگاہی
علامہ اقبال؎ نظرِ تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی!
نرسی جز بہ تقاضائے کلیم اللّٰہی

(پیام مشرق - ۲۱۶)

حافظ؎ بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است
بیا کہ بلبل شوریدہ نغمہ پرداز است
عروسِ لالہ سراپا کرشمہ و ناز است

(پیام مشرق ۲۱۴)

حافظ ۔ روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست
منت خاکِ درت بربصرے نیست کہ نیست

علامہ اقبال ۔ سرخوش از بادۂ تو خمِ شکنے نیست کہ نیست
(بہ تبدیل قافیہ) مستِ لعلینِ تو شیریں سخنے نیست کہ نیست!

(پیام مشرق ۔ ۲۱۷)

حافظ ۔ جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست
سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

علامہ اقبال ۔ اگرچہ زیبِ سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست

(پیام مشرق ۔ ۲۲۷)

حافظ ۔ اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز است
ببانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

علامہ اقبال ۔ نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است
ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است

(پیام مشرق ۔ ۲۳۷)

علامہ اقبال نوائے من از آں پُر سوز و بیباک و غم انگیز است
بہ تبدیل بحر بجاشاکم شرار افتاد و باد صبحدم تیز است

(از بورِ عجم ۔ ۱۹)

حافظ ؎ خیزو در کاسہ ام از آب طربناک انداز
پیشتر زانکہ شود کاسہ سر خاک انداز
علامہ اقبال ؎ ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز

(از زبورِ عجم۔۴۰)

حافظ ؎ زدستِ کوتہِ خود زیر بارم !!
کہ از بالا بلنداں شرمسارم
علامہ اقبال ؎ ہوائے خانہ و منزل ندارم
سرِ راہم غریبِ ہر دیارم

(زبورِ عجم۔۵۴)

حافظ ؎ ما بدیں در نہ پئے حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ ایں جا بہ پناہ آمدہ ایم
علامہ اقبال ؎ ماکہ افتندہ تر از پرتوِ مہ آمدہ ایم!
کس چہ داند کہ چساں ایں ہمہ رہ آمدہ ایم

(از زبورِ عجم۔۸۴)

حافظ ؎ بسرّ جامِ جم آنگہ نظر تواني کرد
کہ خاک میکدہ کحل بصر تواني کرد
علامہ اقبال ؎ درونِ لالہ گزر چوں صبا تواني کرد
(بہ تبدیل قافیہ) بیک نفس گرہِ غنچہ وا تواني کرد

(از زبورِ عجم۔۹۰)

حافظ؎ در ازل پرتوِ حسنت ز تجلی دم زد!
عشق پیدا شد و آتش بہمہ عالم زد
علامہ اقبال عقل چوں پائے دریں راہِ خم اندر خم زد
شعلہ در آب دوانید و جہاں برہم زد

——————— (پیام مشرق - ۲۲۷)

حافظ؎ زلف آشفتہ و خوئے کردہ و خنداں لب و مست
پیرہن چاک و غزلخواں و صراحی در دست!
علامہ اقبال؎ عشق گردید ہوس پیشہ و ہر بند گسست
آدم از فتنۂ او صورتِ ماہی در شست!

——————— (پیام مشرق - ۲۲۹)

حافظ؎ شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیرِ کنعاں گفت
فراقِ یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت
علامہ اقبال؎ دگر ز سادہ دلیہائے یار نتواں گفت
نشستہ بر سر بالینِ من ز درماں گفت!

——————— (زبورِ عجم - ۹۴)

حافظ؎ تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود!
سرِ ما خاک رہِ پیرِ مغاں خواہد بود!
علامہ اقبال زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ایں مے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

——————— (پیام مشرق - ۲۲۰)

حافظ؎ درخرابات مغاں نورِ خدا می بینم!
ایں عجب بیں کہ چہ نورے ز کجا می بینم

علامہ اقبال؎ من دریں خاک کہن گوہرِ جاں می بینم
(بہ تبدیل قافیہ) چشم ہر ذرّہ چو انجم نگراں می بینم

(پیام مشرق - ۲۲۱)

حافظ؎ بناں بلبل اگر بامنت سر یاریست!
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست!

علامہ اقبال؎ ہوس ہنوز تماشا گر جہانداریست
دگر چہ فتنہ پس پردہ ہائے زنگاریست

(زبور عجم - ۱۰۸)

حافظ؎ زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست!
درحق ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

علامہ اقبال؎ از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست
پیش محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست

(زبور عجم - ۱۲۰)

حافظ؎ شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد!

علامہ اقبال؎ عاشق آں نیست کہ لب پُر ز فغانے دارد
عاشق آنست کہ بر کف دو جہانے دارد

(زبور عجم - ۱۳۰)

حافظ: اے فروغِ ماہِ حسن از روئے رخشانِ شُما
آب روئے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما

علامہ اقبال: چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما!
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما!

(زبورِ عجم۔ ۱۷۰)

ہم قافیہ غزلوں یا شعروں کا موازنہ کوئی اچھا معیارِ تنقید نہیں، تاہم بطریق سہولت جو مطلعے اوپر دیئے گئے ہیں اگر انہی تک نظر محدود رہے جب بھی علامہ اقبال اور خواجہ حافظ کے اسلوبِ غزل پر ایک طرح سے روشنی ضرور پڑ جاتی ہے۔ بعض مطلعوں میں خواجہ حافظ برتر ہے۔ اور بعض میں علامہ اقبال اوپر نکل گئے۔ مثلاً بتواں گفت، اور دہاں گفت، دونوں مطلعے روایتی ہیں مگر خواجہ حافظ کے بیان میں بے ساختگی ہے اور علامہ اقبال کے یہاں تکلف اور اختراع حاوی ہے اسی طرح سکندری داند اور چاکری داند، کو دیکھئے، حافظ کا مطلع بہت اونچا ہے۔ اس کے مقابل علامہ اقبال کے مطلعے میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی، مگر اکراہ نیست اور راہ نیست والے مطلعوں میں علامہ اقبال کے یہاں گہرائی اور گداز نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ بات دونوں ظاہر و باطن کی بیان کر رہے ہیں اور دونوں شاکی ہیں ظاہر بینوں کے، لیکن علامہ اقبال نے نوا، آگاہ، بم، زیر مقام اور راہ کے تلازموں اور تنسیق سے قیامت ڈھا دی ہے، اب آنے وارد اور جہانے وارد ملاحظہ ہو۔ خواجہ صاحب نے شاہد کی بات کی ہے اور علامہ اقبال نے عاشق کی، حافظ نے معشوق کی روایتی صفات کو رد کر کے اسے "آنے"

سے منقّف کرنا چاہا۔ اس کے مقابل علاّمہ اقبال نے عاشق کو اس کی روایتی کارگزاری سے نجات دلا کر فرمانروائے ہر دو جہاں بنانا پسند کیا۔ دونوں ہم آہنگ ہیں —— اب شرمسارم اور ہر دیارم والے مطلعوں پہ نگاہ ڈالیے "زدست کوتہ خود زیر بارم" کی رعایت بجا مگر یہ مضمون علاّمہ اقبال کے مضمون کے مقابل محدود ہے۔ چلتے چلتے دو مطلعے اور دیکھ لیجئے۔ حوالہ گاہے نیست؛ پیلہ ہے نیست' دونوں اس طرح ہم رنگ' یک جان اور ہم آہنگ ہیں کہ علاّمہ اقبال کا مطلع خواجہ حافظ کی غزل کا نہایت موزوں حسنِ مطلع بن سکتا ہے۔

غرض یہ کہ علاّمہ اقبال کا معیارِ شعرِ فارسی خواجہ حافظ کے معیار سے خاصہ قریب ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی رائے سابق سطور میں رقم ہو چکی ہے کہ علاّمہ اقبال کی کئی غزلوں کو خواجہ حافظ کے دیوان میں بآسانی داخل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ وہاں بخوبی رچ بس جائیں گے۔ مگر میرے خیال میں پوری غزلوں کے باب میں یہ رائے مستقیم ثابت نہ ہوگی، ہاں درجنوں اشعار کے ضمن میں ایسا کہا جا سکتا ہے۔ پوری غزلوں کی بابت بحث آگے آئے گی۔

علّامہ اقبال اور نظیری نیشاپوری

یہی عالم علّامہ اقبال اور نظیری نیشاپوری کا ہے۔ صفوی دَور کے شعرا میں سے جو وارد ہند ہوئے ان میں نظیری کا ایک پہلو حافظ کے قریب تر ہے۔ ہندی سبک کی ضرورت سے زیادہ بدنام نازک خیالی سے متصف یا ملوث ہونے کے باوصف حق یہ ہے کہ نظیری کی غزل کی رُوح میں خواجۂ حافظ کی ترنگ خاصی موجود ہے۔ اور پھر نظری ہی پر کیا بس خواجۂ حافظ نے فارسی غزل کو وہ ترقی دی کہ آنے والوں کے لیے معیار بن گئے۔ اور آج تک حسنِ بیان کے اس معیار کو پہنچ جانا ایک طرح سے معراجِ کمال متصوّر ہوتا رہا ہے چہ جائیکہ اس معیار کو بلند تر کیا جائے ______

بہرحال اب نظیری نیشاپوری اور علّامہ اقبال کے مطلعے ملاحظہ ہوں، ایک ایسے شاعر کی رمز آشنائی طلب داد ہے جس کی مادری زبان فارسی نہیں جس نے سرزمین ایران میں کبھی رہائش اختیار نہ کی۔ جس نے ایرانی اہلِ زبان کی محفلیں کبھی شاذونادر ہی دیکھیں، اس کے باوصف وہ کلاسیکی فارسی زبان کے رنگ میں کا ملاً رنگا ہُوا ہے۔ خود ہی تو فرمایا تھا کہ میری نوا شیرازی ہے۔

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر!
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

نظیری ؎ دردِ دل را می کنم با صبر پیوندے دگر
برطبیب خود تغافل می زنم چندے دگر
علامہ اقبال ؎ می تراشد فکر من ہر دم خداوندے دگر
رست از یک دام تا افتاد در بندے دگر (پیامِ مشرق ۔ ۱۰۰)

نظیری ؎ چو عریاں شد چمن مرغ از ضرورت خانہ می سازد
چو قحطِ گل شود بلبل بآب و دانہ می سازد
علامہ اقبال ؎ ہوائے فرودیں در گلستاں میخانہ می سازد
سبو از غنچہ می ریزد ز گل پیمانہ می سازد (پیامِ مشرق ۔ ۱۸۰)

نظیری ؎ گریز از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست
علامہ اقبال ؎ ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلّی دگرے درخورِ تقاضا نیست (پیامِ مشرق ۔ ۱۸۸)

اس غزل میں علامہ اقبال نے نظیری کے ایک مصرعے پر گرہ لگا کر جس طرح داد دی ہے لائقِ تحسین اور قابلِ توجہ ہے۔

بملکِ جم ندہم مصرعۂ نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

نظیری ؎ گر بسخن در آورم عشقِ سخن سرائے را

بر برو دوشش سر دہی گریہ ہائے ہائے را

علّامہ اقبال ؎ بازبسرمہ تاب دہ چشمِ کرشمہ زائے را

ذوقِ جنوں دو چند کُن شوقِ غزلسرائے را (پیامِ مشرق ۔ ۱۹۲)

نظیری ؎ جزائے حسنِ عمل در شریعتِ عربیست

بحرفِ عفو نکردن گناہ بے ادبیست

علّامہ اقبال ؎ بشاخِ زندگی مانمے ز تشنہ لبیست

تلاشِ چشمۂ حیواں دلیلِ کم طلبیست (پیامِ مشرق ۔ ۱۹۶)

نظیری ؎ ہر کہ نوشید مئے عشقِ تو پایانش نیست

وانکہ محوِ تو شد اندیشۂ حرمانش نیست

علّامہ اقبال ؎ خواجۂ نیست کہ چوں بندہ پرستارش نیست

(بہ تبدیل قافیہ) بندۂ نیست کہ چوں خواجہ خریدارش نیست (پیامِ مشرق ۔ ۲۱۱)

نظیری ؎ بدستِ طبعِ عنان دادۂ دریغ از تو

بچنگ صد ہوس افتادۂ دریغ از تو

علّامہ اقبال ؎ بتانِ تازہ تراشیدۂ دریغ از تو

(بہ تبدیل قافیہ) درونِ خویش نہ کاویدہ دریغ از تو (پیامِ مشرق ۔ ۲۲۱)

نظیری ؎ غیرِ مَن در پسِ ایں پردہ سخن سازے ہست
راز در دل نتواں داشت کہ غمازے ہست

علامہ اقبال ؎ گرچہ شاہینِ خرد بر سرِ پروازے ہست
اندریں بادیہ پنہاں قدر اندازے ہست (زبورِ عجم - ۲۰)

نظیری ؎ شد آخر روز و برنائی و میلِ دل ہماں باقی
بلا گردید ضعفِ پیری و طغیانِ مشتاقی

علامہ اقبال ؎ دریں محفل کہ کار او گذشت از بادۂ و ساقی
ندیمے کو کہ در جامش فرو ریزم مئے باقی (زبورِ عجم - ۳۸)

یہ زمین حافظ و نظیری میں مشترک ہے۔

نظیری ؎ جام گیر اخترِ افتادہ بر افلاک انداز
روح شو عاریتِ خاک سوئے خاک انداز

علامہ اقبال ؎ ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز (زبورِ عجم - ۴۰)

نظیری ؎ خمش زلابہ کہ طبعش مشوش است ہنوز
شکر بخور مکن شعلہ سرکش است ہنوز

علامہ اقبال ؎ مرا براہِ طلب بار در گل است ہنوز
(بہ تبدیل قافیہ) کہ دل بقافلۂ و رختِ منزل است ہنوز (زبورِ عجم - ۵۲)

نظیری ؎ کجا بودی کہ امشب سوختی آزردہ جانے را
بقدرِ روزِ محشر طول دادی ہر زمانے را

علامہ اقبال ؎ بحرفے میتواں گفتن تمنائے زمانے را
من از شوقِ حضوری طول دادم داستانے را (زبورِ عجم۔ ۷۶)

نظیری ؎ بسینہ گریہ گرہ شد نقاب بر تر کش
دلِ کباب مرا ز آتش دروں برکش

علامہ اقبال ؎ چو موج مستِ خودی باش و سر بطوفاں کش
(بہ تبدیل قافیہ) ترا کہ گفت کہ بنشین و پا بداماں کش (زبورِ عجم۔ ۱۰۲)

نظیری ؎ مردانہ قمارے کن دستے بدو عالم زن
خصلی کہ نہی پُر نہ نقشی کہ زنی کم زن

علامہ اقبال ؎ با نشہ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن (زبورِ عجم۔۱۰۹)

علامہ اقبال اور نظیری کی یہ غزلیں درحقیقت مولانا روم کے تتبع میں ہیں۔ یہ زمین مولانا روم کی ملک ہے۔ مولانا روم کی اس میں دو غزلیں ہیں۔

زمین ذیل میں حافظ کی غزل بھی ہے۔

نظیری ؎ داند اخلاص مرا و ز حالِ من آگاہ نیست
در درش دادم رہ و بر آستانم راہ نیست

علامہ اقبال ؎ ازنوا بر من قیامت رفت وکس آگاہ نیست
پیش محفل جز بم وزیر و مقام و راہ نیست (زبورِ عجم - ۱۲۲)

نظیری ؎ بغیر از رنگ و بوئے نیست ایں عشقِ مجازی را
عطا کن لذتِ طعمِ حقیقت عشق بازی را
علامہ اقبال ؎ نیابی در جہاں یارے کہ داند دلنوازی را
بخود گم شو نگہدار آبروئے عشق بازی را (زبورِ عجم - ۱۴۸)

نظیری ؎ بہوش سیرِ چمن کن کہ شاہداں مستند
قرابہ بر سرابر بہار بشکستند !
علامہ اقبال ؎ بیا کہ خاوریاں نقش تازہ بستند
دگر مرو بطوافِ بتے کہ بشکستند (زبورِ عجم - ۱۵۲)

نظیری ؎ رفیق تر نکند در رہِ تو کام رفیق
ترا دلے ز غم آزاد ہمچو بیتِ عتیق !
علامہ اقبال ؎ ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز اینکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق (زبورِ عجم - ۱۶۰)

نظیری ؎ ہنوز راہِ نگاہم ببام و در ندہند
کبوترے کہ بیاموختند سر ندہند

علامہ اقبال ؎ گذر از انکہ ندیدست و جُز خبر ندہد
(رومی بدل کر) سخن دراز کند لذّتِ نظر ندہد (زبورِعجم۔۱۸۰)

نظیری ؎ گوید سحر کہ شب گذر انگندۂ بباغ
گل ہا نشاں دہند ز تو بُلبُلاں سراغ

علامہ اقبال ؎ اے لالہ اے چراغِ گلستان و باغ وراغ
در من نگر کہ می دہم از زندگی سراغ (زبورِعجم۔ ۱۹۶)

نظیری ؎ چہ خوش است از دو یک دل سرِ حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن، گلہ را دراز کردن

علامہ اقبال ؎ چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
(نظم تسخیرِ فطرت) دل کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن (پیامِ مشرق-۹۹)

نظیری اور علامہ اقبال کے مطلعے جس ہم آہنگی کے مالک ہیں، واضح ہے، علامہ اقبال کے کئی مطلعے ایسے ہیں کہ اگر نظیری کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں اور اسی طرح نظیری کے کئی مطلعے ایسے ہیں کہ اگر انھیں علامہ اقبال سے منسوب کر دیا جائے اور لکھ یا سنا دیا جائے تو چند خاص اقبال شناسوں کے علاوہ کسی کو پتہ نہ چلے، وہ خاص اقبال شناس حضرات بھی ملکیت کا دعویٰ مسترد کریں گے اور یہ نہ کہیں گے کہ رنگ ایک سا نہیں حالانکہ مطلعوں کا مطالعہ و موازنہ کوئی بہتر حکم نہیں۔

ان ہم مطلع غزلوں میں بہت سے اشعار ہم مزاج ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت علامہ کی پوری غزل دیکھیں تو اقبالیت اپنا امتیاز ثابت کردیتی ہے اور اس کا سبب ماحول کی تبدیلی اور نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کا نظریۂ حیات و کائنات وہ نہیں جو نظیری کا ہوسکتا ہے ـــــــ لیکن جہاں بات عشق و محبت کی ہو، یا عام جذبات و احساساتِ آدم کا مضمون ہو وہاں نظیری اور علامہ اقبال ہم زبان دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ اقبال خود ہی تو کہتے ہیں۔

ے زشعرِ دلکش اقبال میتواں دریافت
که درسِ فلسفه میداد و عاشقی ورزید

اب ذیل کے چار اشعار دیکھیے۔

ے بہوش سیرِ چمن کن که شاہداں مستند
قرابه بر سرِ ابرِ بہار بشکستند!

ے چه جلوه ایست که دلہا بلذّتِ نگہے
زخاکِ راه مثالِ شراره بر جستند!

ے کجاست منزلِ تورانیانِ شہر آشوب
که سینه ہائے خود از تیزیٔ نفس بستند!

ے تو نخلِ خوش ثمر کیستی که باغ و چمن
ہمه زخویش بریدند و در تو پیوستند

ان میں دو شعر نظیری کے ہیں اور دو علامہ اقبال کے۔

دقّ الزّجاج و رقّتِ الخمر
فتشابها و تشاکل الامر

والا معاملہ ہے ـــــــ فرق آسانی سے معلوم نہ ہوگا۔ ہاں اگر علامہ اقبال کی ساری غزل مطالعہ کی جائے تو مطلع ہی غمازی پر اُتر آئے گا کہ یہ کس دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ ظاہر ہے کہ ذیل کا شعر نظیری سے منسوب کر کے نہیں سنایا جاسکتا۔

بیا کہ خاوریاں نقش تازہ بستند
دگر مرو بطوافِ بتے کہ بشکستند

نظیری کا یہ مسئلہ نہ تھا کہ اہلِ خاور کی خودی بیدار کرے اور مغربی قمار بازوں کے زوال کی خبر دے۔ اور اہلِ خاور کو ان کے مقابل احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ اسی طرح یہ شعر بھی نظیری کے نام سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔

تو ہم بذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق
بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند!

ہاں شعر ذیل نظیری کا بھی ہوسکتا ہے

بچشم مردہ دلاں کائنات زندانے است
دو جام بادہ کشیدند و از جہاں رستند

لیکن غزل کا آخری شعر پھر نظیری کی عام روش سے ہٹ جاتا ہے

فرشتہ را دگر آں فرصتِ سجود کجاست
کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند

مطلب یہ کہ علامہ اقبال کی پوری غزل پر نظر ڈالی جائے تو وہ بہر حال دوسروں سے الگ کھڑے ہیں، یہ بحث شاید آگے بھی کہیں آئے۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

——— اقبال

علّامہ اقبال اور مولانا رُوم

اب ہم مولانا روم کی ان غزلوں کی طرف آتے ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کی غزلوں کو متاثر کیا ہے۔ مولانا روم کی اکثر غزلوں کا آہنگ کلاسکی فارسی غزل کے آہنگ سے قدرے جُدا ہے۔ ان کی غزلوں کے اُوزان ایک کیفیت کی نشان دہی کرتے۔ گویا اہلِ حلقہ مست ہیں۔ دائرے میں ہیں، گردش کر رہے ہیں، سر اکٹھے جھکتے ہیں، اکٹھے اٹھتے ہیں اور شاید تالی بھی پٹتی ہے۔ چنانچہ پُرجوش ٹھہراؤ اور ٹھہری ہوئی حرکت کا سا سماں ہے۔ اس آہنگ نے علامہ اقبال کی بہت سی فارسی غزلوں ہی کو نہیں بلکہ بالِ جبریل کی کئی اُردو غزلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو مولانا روم کی غزلوں کی چھاپ حافظ اور نظیری کے بعد سب سے زیادہ ہے اور لطف یہ ہے کہ نظیری نے بھی بارہا مولانا روم کا اتباع کیا ہے اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ نظیری کے تغزل سے شغف رکھنے والوں کو اس نظر سے بھی دیوانِ نظیری کو دیکھنا چاہیے ـــــ علامہ اقبال کی کئی غزلیں مولانا روم کی غزلوں کی ہم زمین اور ہم طرح ہیں جن کا ذکر ابھی کیا جائے گا۔ مگر کئی غزلیں ایسی ہیں جو قافیے اور زمین کی رُو سے مولانا روم کے اتباع میں نہیں۔ مگر

آہنگ بلکہ ترنگ مولانا روم کی سی ہے اور نگاہوں میں حلقۂ مولویہ کا منظرِ رقص کرنے لگتا ہے۔ یہ اس لیے کہ مولانا روم کے ساتھ فکری، قلبی اور رُوحانی تعلق دوسرے شعرائے کبار کے مقابل استوار تر تھا۔ ذیل میں علامہ اقبال کی ان غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں جو مولانا روم کی زمین میں تو نہیں مگر ترنگ مولانائی ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر سیّد محمد اکرم شاہ کی کتاب "اقبال در راہ مولوی" کا مطالعہ بھی پُرلطف ہے ـــــ

ع
برعقل فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ
یک ذرّہ دردِ دل از عقل فلاطوں بہ

ع
شب من سحر نمودی کہ بطلعت آفتابی
تو بطلعت آفتابی سزد اینکہ بے حجابی!

ع
از مشتِ غبار ما صد نالہ برانگیزی
نزدیک تر از جانی با خوے کم آمیزی

ع
من اگرچہ تیرہ خاکم دلکے است برگ سازم
بنظارۂ جمالے چو ستارہ دیدہ بازم

ع
بصدائے دردمندے بنوائے دلپذیرے
خمِ زندگی کشادم بجہانِ تشنہ میرے

ے فصلِ بہار ایں چنیں بانگِ ہزار ایں چنیں
چہرہ کشا غزل سرا، بادہ بیار ایں چنیں

ے من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شبہا
شبہا کہ سحر گردد از گردشِ کوکبہا

ے خیز و بخاکِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں
آتشِ خود بلند کن آتشِ ما فرونشاں

ے از چشمِ ساقی مستِ شرابم
بے مے خرابم، بے مے خرابم

ے بدہ آں دل کہ مستی ہائے او از بادۂ خویش است
بگیر آں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است

ے کفِ خاکِ برگ و سازم بہ رہے فشانم او را
بامید آں کہ روزے بفلک رسانم او را

انجم بگریباں ریخت ایں دیدۂ تر ما را!
بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوقِ نظر ما را

فرصتِ کشمکش مده ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوے تابدار را

چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

ما از خدائے گم شده ایم او بجستجوست
چوں ما نیازمند و گرفتار آرزوست

از ہمہ کس کناره گیر، صحبتِ آشنا طلب!
ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

ے صورت پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیلِ سبکسارم، ہر بند شکستم من

ے دانۂ سبحہ بزنّار کشیدن آموز
گر نگاہ تو دو بین است ندیدن آموز

ے صد نالۂ شبگیرے، صد صبح بلا خیزے
صد آہ شرر ریزے، یک شعرِ دلآویزے

ے فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بُت خانہ
ایں جلوتِ جانانہ، آں خلوتِ جانانہ

ان ساری غزلوں کی بحور مترنم ہیں۔ اندرونی قوافی بہار دکھا رہے ہیں۔ اور ایسی بحور میں تکرار لازمہ نہ سہی مگر جادو ضرور جگاتا ہے۔ گویا حضرتِ علامہ نے اپنے مخصوص افکار کو ان حسین سانچوں میں ڈھال کر دلآویز بنا دیا ہے۔ مولانا روم کی ان پسندیدہ بحور کی ایک نمایاں جھلک خواجہ امیر خسرو کے کلام میں بھی دکھائی دیتی ہے اور یہ تو واضح ہی ہے کہ امیر خسرو ترنم و موسیقی کے بادشاہ تھے اور ان کی غزلوں پر افکار و خیالات کے مقابلے میں موسیقی حاوی ہے۔ ہاں مگر مستی اس درجے کی نہیں جو مولانا روم کے کلام میں ہے۔ امیر خسرو جام سے بھی کھیلے، سنداں سے بھی، مُرشد ایک تھا مگر شعر کی فرمائش

کرنے والے مُربّی اور قدردان در جنوں؛ چنانچہ وہ کمال یک رنگی جو مولانا روم کے کلام میں ہے وہ ان کے کلام میں جلوہ گر ہوتا بھی کیسے ؟

خیر تو ذکر تھا مولانا روم کے ان اثرات کا جو علامہ اقبال کی غزلوں نے قبول کیے۔ اس باب میں یہ بات واضح کر دی جانی چاہیے کہ مولانا روم سے متأثر علامہ اقبال کی غزلوں کی زیادہ تعداد زبورِ عجم سے تعلق رکھتی ہے۔ جن غزلوں کے مطلعے اُوپر درج کیے گئے ہیں ان میں آخری چار غزلوں کو چھوڑ کر باقی سب زبورِ عجم کا حصّہ ہیں۔ حافظ اور نظیری سے متأثر غزلیں پیامِ مشرق میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ زبورِ عجم ہی کی گونج بالِ جبریل میں دکھائی دیتی ہے۔ اور زبورِ عجم ہی کی طرح بالِ جبریل کی غزلیں بھی دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصہ ایک طرح سے "بحضورِ خُدا" کا مزاج رکھتا ہے اور دوسرا "بحضورِ آدم" کا۔ وضاحت آگے آتی ہے۔

بہرحال اب ہم علامہ اقبال کی ان غزلوں کی طرف آتے ہیں جو مولانا روم کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔

مولانا روم ؎ بنمائے رُخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
بگشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست

علامہ اقبال ؎ تیرِ و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
(قافیہ بدل کر) بامن میا کہ مسلکِ شبّیرم آرزوست پیامِ مشرق۔ ۱۸۵

اس زمین میں سعدی نے بھی غزل کہی ہے، صائب نے بھی، مولانا عراقی نے بھی۔

مولانا روم ؎ جاناں نظرے فرما چوں جان نظر ہائی
چوں گویم دل بُردی چوں عین دل مائی
علامہ اقبال ؎ ایں گنبدِ مینائی، ایں پستی و بالائی
درشد بدلِ عاشق، با ایں ہمہ پہنائی (پیامِ مشرق۔۲۰۰)

مولانا روم ؎ ہر نفس آواز عشق میرسد از چپ و راست
ما بفلک میرویم، عزم تماشا کراست
علامہ اقبال ؎ گریۂ ما بے اثر، نالۂ ما نارساست
حاصل ایں سوز و ساز یک دل خونیں نواست (پیامِ مشرق۔۲۰۴)

مولانا روم ؎ چمنے کہ تا قیامت گل او بہار بادا
صنمی کہ بر جمالش دو جہاں نثار بادا
علامہ اقبال ؎ عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بُو را نفسم بہار بادا (پیامِ مشرق۔۲۱۵)

مولانا روم ؎ بباغ آئیم فردا جملہ یاراں
ہمہ یارانِ ہمدل ہمچو یاراں
علامہ اقبال ؎ زمستاں را سر آمد روزگاراں
نواہا زندہ شد در شاخساراں (زبورِ عجم۔۵۳)

مولانا روم ؎ صنما جفا رہا کن کرم ایں روا ندارد !
بنگر بسوئے دردے کہ زکس دوا ندارد

علامہ اقبال ؎ بفغاں نہ لب کشودم کہ فغاں اثر ندارد
(قافیہ بدل کر) غم دل نگفتہ بہتر، ہمہ کس جگر ندارد (زبور عجم۔ ۸۲)

مولانا روم ؎ اے صاحب دریا دل بر یار مقدم زن
آں نورِ ہدایت را بر چہرۂ عالم زن

اس زمین میں مولانا کی دو غزلیں ہیں۔ دوسری کا مطلع ہے
؎ اے یارِ مقامر! دل پیش آر و دمے کم زن
زخمے کہ زنی بر ما مردانہ و محکم زن

علامہ اقبال ؎ با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن !
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن ! (زبور عجم۔ ۱۰۶)

مولانا روم ؎ ہلہ عاشقاں بشارت کہ نماند ایں جدائی
برسد وصال دولت، بکند خدا خدائی

علامہ اقبال د نظم حور و شاعر جو اسی عنوان کے تحت لکھی ہوئی گوئٹے کی نظم کے جواب میں ہے۔
؎ نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب اینکہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی (پیامِ مشرق۔ ۱۴۷)

مولانا روم ؎ تو تفس نفس دریں دل ہو سے دگر گماری
چہ خوش است ایں صبوری چہ کنم نمی گذاری

علامہ اقبال ؎ دل رہرواں فریبی بکلام نیش دارے
مگر ایں کہ لذتِ او نرسد بنوک خارے (پیامِ مشرق - ۱۴۸)

(ردی کی یائے معروف کو یائے مجہول میں بدل کر نظم "جوابِ شاعر" میں)

مگر حق یہ ہے کہ مولانا روم کی سینکڑوں غزلوں میں ایسی غزلیں تھوڑی ہیں جن میں فکر و خیال کی نزاکت اور گہرائی سرتاپا موجود ہو ـــــ ترنم کا جادو تو ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو مثنوی میں عمق فکر و بلندیٔ خیال و وسعتِ معانی اور بعض مقامات پر موسیقیت کے سازِ دلسوز کی بکمال فن آمیزش کا پلہ نسبتاً بھاری ہے۔ جیسے اور جتنے قابل شعر مثنوی سے نکالے جاسکتے ہیں اس تناسب سے مولانا روم کی غزلوں میں مہیا اور میسر نہیں۔ شاید پرگوئی کو اس کا باعث بتایا جاسکتا ہو۔ مگر پرگوئی تو بیدل کے یہاں بھی ہے۔ بلکہ بیدل بہت زیادہ پرگو ہیں۔ اس کے باوصف بیدل کی غزلوں کا عالم ہی جُدا ہے۔ مولانا کی غزلیات میں مثنوی کے ان چند تمہیدی اشعار کا بدل کم ازکم راقم الحروف کو تو نہیں مل سکا۔

بشنو از نی چوں حکایت میکند
وز جدائیہا شکایت میکند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگارِ وصل خویش!

ہر کسے از ظنِ خود شُد یارِ من
وز درونِ من نجست اسرارِ مَن
سرِّ من از نالہء من دُور نیست
لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جاں و جاں ز تن مستور نیست
لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست
آتشِ عشق است کندر نےَ فتاد
جوششِ عشق است کندر مےَ فتاد
بادہ از ما مست شُد نی ما ازو
قالب از ما ہست شد نی ما ازو

مطلب یہ کہ مولانا روم کی غزلوں میں اعلیٰ درجے کے شعروں کی تعداد زیادہ نہیں ۔ اس کے مقابل علّامہ اقبال کے اشعارِ غزل میں بھرتی تقریباً ناموجود، تھوڑی سی غزلیں ہیں اور ہر غزل میں تھوڑے تھوڑے سے شعر ہیں ۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا روم کے آہنگ میں کہے جانے والے اشعار اور غزلیں بارہا مولانا روم کے شعروں اور غزلوں سے بلند ہو گئے ہیں ۔ ہاں مگر جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا ہے تھوڑی سی تعداد مولانا کی غزلوں کی بھی زوردار ہے ۔ جن میں "برہم زن" اور "آزردست" والی غزلیں شامل ہیں ۔

علّامہ اقبال اور خواجۂ امیر خسرو دہلوی

مولانا روم کی غزلوں کے بعد خواجہ امیر خسرو کی ان غزلوں کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے جن کے تتبع میں علّامہ اقبال نے غزلیں کہیں یا کم از کم ہمیں احساس ہوتا ہے کہ حضرت امیر خسرو کا تتبع کیا گیا ہے۔ ذیل میں حضرت امیر خسرو کی غزل کے چار شعر درج کیے جاتے ہیں۔

ے شب فراق سیاہ مرا سیاہ تر است
کہ شام تا سحرم زلف یار در نظر است
چگونہ تیرہ نباشد رُخم کہ شمع مراد
نمی فروزد ازیں آتشے کہ در جگر است
مگو کہ چند شوی بے خبر ز مستیٔ عشق
کسے کہ مستیش از عشق نیست بے خبر است
تو مست بودی و خسرو خراب تو سحرے
گذشت عمر و ہنوزم خمار آں سحر است

اسی زمین میں کہی جانے والی علّامہ اقبال کی غزل کے بھی چار شعر دیکھیے۔

ہ مراز دیدہ بینا شکایتِ دگر است!
کہ چوں بجلوہ درائی حجابِ من نظر است
مثالِ لالہ فتادم بگوشہ چمنے
مراز تیرِ نگاہے نشانہ بر جگر است
ہزار انجمن آراستند و برچیدند!
دریں سراچہ کہ روشن زمشعل قمر است
نوازئیم و بہ بزم بہار می سوزیم
شرر بہ مشتِ پر ما زنالۂ سحر است

خواجہ امیر خسرو کا دوسرا تیسرا شعر علامہ اقبال کے مزاج کا ہے۔ علامہ اقبال کا مطلع خواجہ امیر خسرو کی غزل کو بآرام وسہولت دیا جا سکتا ہے۔ مگر اسی غزل میں علامہ اقبال کے وہ شعر بھی ہیں جو خالص اقبالی ہیں اور جو امیر خسرو یا اکثر و بیشتر دیگر فارسی شعرا کی غزل میں نہیں سما سکتے۔ مثال کے طور پر

ہ بہ نوریاں زمن پا بگل پیامے گو
حذر ز مشتِ غبارے کہ خویشتن نگر است
اگر نہ بوالہوسی با تو نکتہ گویم!
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است
نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب زنغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

جیسا کہ مولانا روم کی غزلوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے قبل ازیں عرض کیا

جا چکا ہے کہ خواجہ امیر خسرو کی غزلوں میں کہیں کہیں مولانا روم کے رنگ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ مگر خواجہ امیر خسرو کی غزلوں کے اشعار میں اور خود باہم غزلوں میں وہ یکرنگی نہیں ۔ موسیقیت تو دونوں کی غزل پر حاوی ہے، بیان عموماً سادہ ہے، تقریباً حضرت سعدی کی غزل کی سی سادگی، مگر سعدی کے یہاں لفظی سادگی کے ساتھ معنوی شوخی بھی ہے، اس لیے کہ سعدی زیادہ زندہ دل تھے، زیادہ نظرباز تھے، عشق مجازی کے رمز آشنا بھی زیادہ تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ اعلیٰ معیار کے اشعار کے مقابلے میں معذرت خواہ اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔ شاید عدم فرصت اس کا سبب ہو۔ بھرپور توجہ کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت ہے۔ وہ حضرت امیر خسرو کو میسر بھی کہاں تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قابل لحاظ تعداد ایسی غزلوں کی بھی ہو جن کو "فرمائش" کی تعمیل یا ثمرہ قرار دیا جا سکتا ہو۔

تاہم علامہ اقبال کسی شاعر کی جس غزل پر غزل کہتے ہیں وہ عموماً ایسی ہوتی ہے جسے اس شاعر کی اچھی غزلوں میں شمار کیا جانا چاہیے اور جس کو فارسی غزل کی کلاسیکی روایت کی مالک غزلوں کا "اوسط" قرار دیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال "خذ ما صفا دع ما کدر" کے فن میں طاق نظر آتے ہیں بہر حال ذیل میں خواجہ امیر خسرو کی ان غزلوں کے مطلعے دیے جاتے ہیں جن سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے بھی طبع آزمائی کی۔

امیر خسرو ؎
ہمہ شب فرو نیاید بدلم کرشمہ سازے
زشبے است اینکہ دارم غم و نالہ درازے

علامہ اقبال ؎
بملازماں سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے
(پیام مشرق - ۱۷۶)

علامہ اقبال کے شعر کا پہلا مصرع خواہ مخواہ خواجہ حافظ کی جانب توجہ کا رخ موڑ دیتا ہے۔

امیرخسرو ؎ نازکی کہ دیدہ ام آں رُخ ہمچو لالہ را !
سوزم و بر بنیادرم پیش وَے آہ و نالہ را

علامہ اقبال ؎ اے کہ ز من فزودۂ گرمی آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را (زبورِ عجم۔ ۹)

امیرخسرو ؎ مہ من خراب گشتم ز رُخت بیک نظارہ
نظرے ز تو عفا اللہ چہ مییست ستکارہ

علامہ اقبال ؎ دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذّتِ نظارہ
چہ گناہ اگر تراشم صنمے ز سنگِ خارہ (زبورِ عجم۔ ۱۸)

امیرخسرو ؎ نہ کُنم ز عشق توبہ کہ سرِ گناہ دارم
چہ کنم نمی توانم دل خود نگاہ دارم

علامہ اقبال ؎ تو بایں گماں کہ شاید سرِ آستانہ دارم
بطوافِ خانہ کارے بخدائے خانہ دارم (زبورِ عجم۔ ۲۸)

امیرخسرو ؎ بر رُخِ ہمچو مہش طرّۂ چوں شب نگرید
انگبیں در لب شیرینش لباب نگرید

علامہ اقبال ؎ بر جانِ دلِ من تاختنش را نگرید
(بہ تبدیل قافیہ) کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید (زبورِ عجم۔ ۵۱)

امیر خسرو ؎ مبارک ماہ، ماہِ روزہ داراں
بداں مستی فزائے ہوشیاراں

علامہ اقبال ؎ زمستاں را سرآمد روزگاراں
نواہا زندہ شد در شاخساراں ! (زبورِ عجم۔۵۳)

امیر خسرو ؎ ستمے کز تو کشد مرد ستم نتواں گفت
نام بیداد تو جز لطف و کرم نتواں گفت

علامہ اقبال ؎ رمزِ عشق تو بارباب ہوس نتواں گفت
(بہ تبدیل قافیہ) سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت (زبورِ عجم۔۶۷)

امیر خسرو ؎ من و شبہا و یاد آں سر کوئے کہ من دانم !
دلم رفتست و جاں ہم می رود سوئے کہ من دانم

علامہ اقبال ؎ دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
(بہ تبدیل قافیہ) کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم (زبورِ عجم۔۹۲)

امیر خسرو ؎ مرا بسوئے تو پیوندِ دوستی خام است
بآفتاب ز ذرّہ چہ جائے پیغام است

علامہ اقبال ؎ زمانہ قاصد طیّار آں دلآرام است
چہ قاصدے کہ وجودش تمام پیغام است (زبورِ عجم۔۹۲)

امیر خسرو ؎ سرم فدات چوں تیغ تو گرد سر گردد
دلم نہ ماند کہ تیر ترا سپر گردد

علامہ اقبال ؎ جہانِ ما ہمہ خاک است و پے سپر گردد
ندانم اینکہ نفسہائے رفتہ بر گردد (زبور عجم۔ ۱۱۹)

امیر خسرو ؎ خطاب طلعتِ تو نامۂ زمیں کردند
فرشتگاں ہمہ بر رویت آفریں کردند

علامہ اقبال ؎ دم مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند
گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند (زبور عجم۔ ۱۷۸)

علّامہ اقبال اور بابا فغانی

علّامہ اقبال کی فارسی غزل کو کلاسیکی فارسی غزل کے جس "اوسط" سے تعلق اور پیوند ہے، اس کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ اب ہم بابا فغانی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

بابا فغانی کو سبکِ ہندی کے اوّلیں سرِراہوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی رنگینیِٔ ادا، نزاکتِ خیال، جدّت طرازی اور تراکیب سازی کی داد دی جاتی ہے۔ اس باب میں شعرالعجم کی جلد سوم خاصی مفید رہبری کرتی ہے۔ فغانی کی تقلید بہت سے شعرا نے کی؛ جن میں نظیری اور صائب جیسے اکابر شامل ہیں —— فغانی، نظیری کے قریب العہد پیشروؤں میں سے تھا۔ صاحبِ مخزن الغرائب نے نظیری کے بارے میں لکھا ہے کہ "و لے طرز بابا فغانی را اختیار نمودہ وآں را بحدِ کمال رسانیدہ"[۱] —— اور آپ مظاہر مصفا کی رائے پہلے ذکرِ خواجہ حافظ کے ضمن میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ نظیری کاملاً حافظ کے متبع ہے —— حالانکہ بات "ہی" کی نہیں، "بھی" کی ہے۔ یعنی نظیری نے حافظ کے رنگ میں بھی خوب کہا اور طرزِ فغانی کو

---

[۱] بحوالہ مقدمہ دیوان فغانی، شائع کردہ شیخ مبارک علی لاہور صفحہ ۲

بھی بطریقِ احسن نبھایا۔

ذیل میں بابا فغانی کی ایک غزل درج کی جاتی ہے۔ اس غزل کے تتبع میں نظیری نے بھی زوردار غزل کہی، اسی زمین میں علامہ اقبال کی غزل بھی ہے۔ دونوں غزلوں کو دیکھ کر واضح ہو جائے گا کہ علامہ اقبال کی غزل ہم رنگ و ہم آہنگ ہونے کے باوصف جدا اور منفرد کیوں ہے۔ فغانی کی غزل ہے۔

اے مرا ہر ذرّہ با مہر تو پیوندے دگر
ہر سرِ مویم بوصلت آرزومندے دگر

بگسل از دام گرفتاری کہ بر ہر ذرّہ اش
از کمندِ زلفِ مشکیں بستہ بندے دگر

من کہ ہمچو غنچہ دارم بالبت دلبستگی
کے کشاید کارم از لعلِ شکر خندے دگر

دل گرفتارِ غم و درد است یکبارش مسوز
از برائے محنتش بگذار یکچندے دگر

چوں نہال نازپرور دِ غمت صورت نہ بست
از زلالِ شیرہ اش جاں یافتہ قندے دگر

نیست بالاتر ز طاقِ آں دو ابروئے بلند
بر زبانِ عشقبازانِ تو سوگندے دگر!

از من بد روز بے ساماں ترے در روزگار
مادرِ گیتی ندارد یاد فرزندے دگر

برنمی گیرد فغانی از رہمت روئے نیاز
گرچہ میگیرد زنازت ہر زماں بندے دگر

اس کے مقابل علامہ اقبال پر نظر ڈالیے۔ مطلع اطلاع دے رہا ہے کہ انھوں نے فغانی اور نظیری کی اس "زمین کو آسمان بنا دیا ہے۔" یہی عالم "سوگندے دگر" والے شعر کا ہے۔ "رُو بندے دگر" سبک ہندی کے روایتی انداز کا زور دار نمائندہ ہے۔ "سمر قندے دگر" کے شعر کا مضمون بتا رہا ہے کہ پابندیٔ روایت کے باوصف اقبال اپنی انفرادیت کی جانب توجہ دلائے بغیر نہیں رہتے اور اپنے دَور کے ملّی تقاضوں کو مضمونِ غزل بنا سکنے پر قادر ہیں۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رَست از یک دام تا افتاد در بندے دگر

بر سرِ بام آ نقاب از چہرہ بیباکانہ کش
نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر

بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش
از نگہ بافم بہ رخسارِ تو رُو بندے دگر

یک نگہ یک خندۂ دزدیدہ یک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

عشق را نازم کہ از بیتابیٔ روزِ فراق
جان ما را بست با دردِ تو پیوندے دگر

تا شوی بیباک تر در نالہ اے مُرغِ بہار
آتشے گیر از حریم سینہ ام چندے دگر!

چنگِ تیموری شکست آہنگِ تیموری بجاست
سر بروں می آرد از سازِ سمرقندے دگر

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

اب علامہ اقبال اور بابا فغانی کی چند ہم طرح غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں۔

بابا فغانی ؎ تازگیٔ کہ شد زمی آں رُخ ہمچو لالہ را
تازہ کند بیک نفس داغِ ہزار سالہ را

علامہ اقبال ؎ اے کہ ز من فزودۂ گرمیٔ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را (زبورِ عجم۔ ۹)

اسی زمین میں خواجہ امیر خسرو کی غزل بھی ہے۔ علامہ اقبال کی پوری غزل دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ دونوں غزلیں ان کے پیشِ نظر تھیں۔ ذیل کی غزلِ فغانی بھی امیر خسرو کی زمین میں ہے اور علامہ اقبال کی غزل پر دونوں کا اثر ہے۔

بابا فغانی ؎ نہ خیال غنچہ بندم نہ بگل کنم کنارہ
کہ مرا دلِ فگار و جگریست پارہ پارہ

علامہ اقبال ؎ دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذتِ نظارہ
چہ گنہ اگر تراشم صنمے ز سنگِ خارہ (زبورِ عجم۔ ۱۸)

بابا فغانی ؎ ہر دم از بزم طرب آں دلنواز آید بروں
چوں مرا بیند رود از ناز و باز آید بروں

علامہ اقبال ؎ خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں
کارواں زیں وادیٔ دُور و دراز آید بروں (زبورِ عجم۔۱۰۳)

بابا فغانی ؎ نہ خوئے نازکت از غیر دیگرگوں شود روزے !
نہ ایں اشک از دل پُر خون من بیروں شود روزے

علامہ اقبال ؎ فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
که ره خوابیده و محمل گرانست

—— اقبال

علّامہ اقبال اور عرفی

علامہ اقبال فارسی غزل کا نقطۂ کمال ایک طرح سے عرفی و نظیری کو جانتے ہیں، جیسا کہ سطور ذیل سے مستنبط ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے انجمن حمایتِ اسلام کے ایک سالانہ اجلاس کے حاضرین سے کہا تھا۔

"اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے،
آج گرامی کو سُن لو کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو دیکھا اور سنا ہے[1]"

اور از روئے مزاج عرفی کو علامہ اقبال سے نظیری کی بہ نسبت قریب تر ہونا چاہیے۔ عرفی کی خود نگہداری، بے نیازانہ ترنگ، جفا طلبی، "زیبِ اسپ و زینتِ برگستواں" کے بجائے غازی کے "دست و تیغ خوں آلود" کو دیکھنے کی عادت۔

ع "حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی"

کی روش ایسی نہیں کہ علامہ اقبال کی نظروں میں اس کی قدر نہ ہوتی چنانچہ علامہ اقبال کا شعر ہے:

حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گرانست

---

[1] مکاتیب اقبال بنام گرامی، صفحہ ۳۷

بانگِ درا کے تیسرے حصے میں ایک نظم ہے جس کا عنوان "عرفی" ہے۔ اس تحسینی نظم کا خاتمہ عرفی کے اسی شعر "گراں بینی" پر ہوتا ہے، علامہ اقبال نے عرفی کا جس طرح تعارف کرایا ہے، ملاحظہ ہو

ے

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیّل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی!
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عنّابی
مرے دل نے یہ اک دن اسکی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
مزاجِ اہلِ عالم میں تغیّر آگیا ایسا
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بارگوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بیخوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت رُبا کیونکر؟
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو!
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی"

علامہ اقبال کس قدر قدردان تھے عرفی کے وہ اس نظم سے ظاہر ہے مگر حیرت

ہے کہ اندازِ بیان انھیں نظیری کا مقابلۃً زیادہ پسند آیا۔ چنانچہ نظیری کی غزلوں پر کئی غزلیں کہیں۔ اس کے برعکس عُرفی کی لے دے کے دو تین غزلوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال نے ان کا تتبع کیا۔ ایک تو "بولبیست" اور "عربیست" والی غزل جس کی طرح حافظؔ نے ڈالی اور جس پر عرفی، نظیری، صائب، غالب، بیدل اور گرامی سب نے طبع آزمائی کی ـــــ اس غزل کے بارے میں سطور سابقہ میں علامہ اقبال کی رائے بیان ہو چکی ہے۔ انھوں نے حافظ کی غزل کو برتر قرار دیا ہے ـــــ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علامہ اقبال کی اس زمین والی غزل خصوصاً عرفی کی پیروی میں لکھی گئی، ازاں بعد عرفی کی "مقام است اینجا"، "عام است اینجا" کی زمین میں معرکے کی غزل ہے۔ درحقیقت یہ سعدی کی زمین ہے اور اس زمین میں سعدی کی غزل بڑی پیاری ہے۔ فیضی کی غزل بھی خاصے کی چیز ہے۔ شیخ علی حزیں کی غزل بھی کسی سے کم نہیں۔ علامہ اقبال کی غزل کا مطلع ہے:

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

مولانا گرامی نے اس غزل پر زوروں کی داد دی ہے۔ مطلع درج کر کے لکھتے ہیں سبحان اللہ کیا شعر ہے۔ مصرعِ ثانی جواب نہیں رکھتا، یا اپنا ثانی نہیں رکھتا، دعوتِ عام دلیلِ اثبات'۔ . . . مولانا گرامی نے اس غزل کے دو اور شعر بھی خط میں درج کیے ہیں اور وہ یہ ہیں

حرفِ آں راز کہ بیگانہ زصوت است ہنوز

از لبِ جام چکیدست، کلام است اینجا

دوش در بتکدہ مستانہ در آمد اقبال!
گردش چشم بتاں گردش جام است اینجا

اور پھر محاکمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

" اقبال کی غزل عرفی کی غزل کا جواب ہے
بلکہ بڑھ کر" [1]

مگر علامہ اقبال نے اس غزل کو غزل نہ رہنے دیا تھا۔ آخر میں ایک شعر خارج از قافیہ کہہ کے لگا دیا اور غزل کو نظم بنا دیا، وہ شعر ہے

ماکہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم
علم راجاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم (پیام مشرق - ۱۴۴)

اب علامہ اقبال کی ایک پوری غزل معائنہ کے لیے پیش کی جاتی ہے، یہ عرفی کی غزل کا جواب ہے، ہم رنگ، ہم آہنگ، عالم یہ ہے کہ دونوں غزلوں میں کئی شعروں کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں غزلیں کلاسیکی فارسی غزل کے رچے ہوئے مزاج اور حسن بیان و خیال کے اس توازن کا نمونہ ہیں جو حافظ سے لے کر علامہ اقبال تک جوئے نغمہ خواں و خوش آب کی طرح رواں ہے۔ اس رَو میں مولانا روم کی غزلوں کا بھی ایک حصہ بخوبی شامل ہے۔ ہم اسی کو کلاسیکی فارسی غزل کا "اوسط" قرار دے رہے ہیں۔ وہ اوسط خیر الغزل ہے۔ اس اوسط کی مالک غزلیں غالب، بیدل صائب، فانی کاشیری، حزیں، کلیم، طالب، فیضی، ظہوری، فغانی، عراقی، نظیری، عُرفی اور حافظ کے یہاں موجود ہیں ——— حافظ کے یہاں یہ اوسط زیادہ ہے (اور درحقیقت

---

[1] مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۱۵۳

یہ اوسط حافظ ہی کے گرد گھومتا ہے) بعض غزلیں سعدی و خسرو کی بھی اسی آہنگ میں رچ بس گئی ہیں۔ چنانچہ اِن شعرا کے بہت سے اشعارِ غزل کا باہم لین دین ممکن ہے۔ بہرحال علّامہ اقبال کی وہ پوری غزل جو عرفی کی غزل کا جواب ہے یہ ہے ———

۵

خیز و نقاب برکشا پردگیان ساز را
نغمۂ تازہ یاد دہ، مرغِ نوا طراز را

جادہ زخونِ رہرواں تختۂ لالہ در بہار
ناز کہ راہ میزند قافلۂ نیاز را

دیدۂ خوابناک او گر بہ چمن کشودۂ !
رخصت یک نظر بدہ نرگس نیم باز را

حرف نگفتۂ شما بر لبِ کودکاں رسید
از منِ بے زبان بگو غلوتیانِ راز را

سجدۂ تو برآورد، از دلِ کافراں خروش
اے کہ دراز تر کنی پیشِ کساں نماز را

گرچہ متاعِ عشق را عقل بہائے کم نہد
من نہ دہم بہ تختِ جم آہِ جگر گداز را

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را

اب عرفی کی غزل کا مطالعہ کیجیے، علّامہ اقبال کی غزل کا بقیہ حصّہ

معلوم ہوتی ہے خصوصاً مقطع کہ خالصتاً اقبال کی مضمون ہے۔

۵ خیز و بجلوہ آب دہ سروِ چمن طراز را !
آب و ہوا زیادہ کن باغچۂ نیاز را

صورتِ حال چوں شود بر تو عیاں کہ می بَرد
نازِ تو جنبش از قلم چہرہ کشائے راز را

آہ کہ طبلِ جنگ زد آنکہ بگاہِ آشتی !
چاشنیٔ ستم دہد لطفِ الم گداز را

تا حرم فرشتگاں از دل و دیں تہی شود
رخصتِ جلوہ بدہ حجلہ نشینِ راز را

اے کہ کشودہ چشمِ جاں در طلبِ حقیقتے
طرف نقاب بر فگن پردگیٔ مجاز را

شہرتِ ناز را کند تلخ بکام دلبراں
عرفی اگر بیاں کند چاشنیٔ نیاز را

علّامہ اقبال اور ابو المعانی مرزا عبدالقادر بیدلؔ

فارسی غزل کی "مئے باقی" کے خمستان ابھی ختم نہیں ہوئے۔ ابھی میخانۂ بیدل اور غالب کی سیر بھی کرنا ہے۔ مرزا بیدل سے علّامہ اقبال کو جو دلچسپی تھی وہ اُن کے اوّلیں دورِ شاعری پر بھی اثر انداز ہے۔ بانگِ درا کے حصّہ اوّل کی شاعری ۱۹۰۵ء تک کی ہے۔ اس حصّے کی ایک مشہور اور اہم نظم "تصویرِ درد" ہے —— اس نظم کا پہلا بند جس طرح کی تراکیب فارسی پیش کرتا ہے۔ اس سے غالب اور بیدل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر پہلا بند جس شعر فارسی پر ختم ہوتا ہے۔ وہ بیدل ہی کا شعر ہے؛[۱]

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دِل تپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

اسی نظم کے ایک بند میں یہ شعر بھی ہیں:—

ع
خدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے!
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!

کنویں میں تونے یوسف کو جو دیکھا بھی کیا دیکھا
ارے غافل جو مطلق تھا مقید کر دیا تونے

اب بیدل کی ایک غزل کے اشعار ذیل دیکھئے

اے اہل آوردہ فطرت را چہ رسوا کردۂ
نوحہ کن دریادِ امروزے کہ فردا کردۂ

حسنِ مطلق را مقیّد تا کجا خواہی شناخت
آہ ازاں یوسف کہ در چاہش تماشا کردۂ

آشنائی شخص با اسم وصفت محتاج چند!
خواندۂ آیات تحقیق و معمّا کردۂ!

پشت و روئے صفحہ ادراک تست اسلام و کفر
سطر قرآں را زکم بینی چلیپا کردۂ

صورتِ آئینہ از حالِ خود غافل مباش
گر ہمہ در خانہ باشی رو بصحرا کردۂ

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی نظر فارسی شاعری کے کس کس گوشے پر تھی اور کب سے تھی۔ بیدل نے اپنے پیشروؤں کی معروف و پسندیدہ زمینوں میں غزلیں کہیں اور نئی زمینیں بھی اٹھائیں خصوصاً طویل بحروں کی غزلیں، بیدل بھی صائب کی طرح دوہری تہری تراکیب کی اختراع کے فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے بلکہ صائب سے بھی دو قدم آگے ہے۔ اضافت مقلوب اور فکِ اضافت کی بھی

فراوانی ہے۔ تشبیہ و تمثیل کی ندرت اور برجستگی اور تجرید کی تجسیم وغیرہ وہ اوصاف ہیں
جو نازک اور لطیف ہو کر جا بجے ایسے ہو گئے ہیں کہ بقول جگر ؎

حسن وہی ہے حسن کہ ظالم!
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے!!

مرزا غالب کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنی ابتدائی شاعری کے دوران
میں کہا تھا۔

؎ فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہُوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!

لیکن وفات سے تقریباً ایک برس پہلے یعنی ۱۹۳۷ء میں انہوں نے شیخ
محمد اکرام صاحب کے نام جو خط لکھا اس میں یہ واضح کیا کہ غالب کو بیدل کے معانی
تک رسائی حاصل نہ تھی۔ شیخ صاحب نے علامہ اقبال کو اپنی تصنیف غالب نامہ
بھیجی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تصریح کی۔

"میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ حضرت غالبؔ کو اردو
نظم میں بیدل کی تقلید میں ناکامی ہوئی۔ غالبؔ نے بیدؔل
کے الفاظ کی نقالی ضرور کی لیکن بیدؔل کے معانی سے اس کا
دامن تہی رہا۔ بیدل کا رہوار فکر اپنے ہمعصروں کے لئے
ذرا گریز پا تھا۔ اس امر کے ثبوت میں شہادت پیش کی جا سکتی
ہے کہ ہند اور بیرونِ ہند کے معاصرین بیدل اور دوسرے
دلدادگانِ نظم فارسی بیدل کے نظریہ حیات کو سمجھنے

سے قاصر رہے ہیں [1]

مگر بیدل کی غزلوں میں بھی جن کا "رہوارِ فکر گریز پا" ہے وہ "اوسط" موجود ہے۔ جو اکابر شعرائے فارسی کی غزلوں کا طغرائے افتخار ہے اور فقط اس "اوسط" کو نکال لیا جائے [2] جب بھی کم از کم نظیری کے مجموعی اشعار کے برابر ہوگا اور فکرِ فن کے اعتبار سے برتر ہوگا۔ ذیل میں ہم بیدل اور علامہ اقبال کی فقط ایک غزل درج کرتے ہیں —— بتائیے کہ بیدل جو مشکل پسندی کے باعث بدنام ہے کیا عرفی اور نظیری اور حافظ کی روایت سے واقعی بہت دور ہے۔

مرزا عبدالقادر بیدل ؎

بعجز کوشش ز نشو و نما چہ میجوئی!
بخاک ریشہ تست از ہوا چہ میجوئی!

دلِ گداختہ اکسیرِ بے نیازیہاست
گداز درد طلب کیمیا چہ میجوئی!

سراغِ قافلۂ عمر سخت ناپیداست
ندہ گزار نفسِ نقش پا چہ میجوئی

بہر چہ طرف کنندت رضا غنیمت دان
ز کارگاہ بقا و فنا چہ میجوئی

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۲۲ [2] بہر حال اس اوسط کا ایک حصہ ہم نے نکال لیا ہے جو تقریباً چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور عنقریب ہدیۂ ناظرین ہوگا (منقّد)

مولانا روم یا خسرو کا مطلع بھی ہو سکتا تھا۔ اسی طرح ایک آدھ جگہ ہم نے چند اشعار یوں درج کیے کہ شاعر کا نام ان کے آگے نہ لکھا۔ ان میں دو ایک شعر علامہ اقبال کے تھے اور دو ایک کسی دوسرے کے، فرق کرنا مشکل تھا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ فرق نمایاں نہ تھا۔

اس تبصرۂ رواں میں ایک بات یہ بھی دہرائی جاتی رہی کہ علامہ اقبال نے کلاسیکی فارسی غزل کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور یہ مطالعہ وسیع بھی تھا۔ طبعی مناسبت موجود تھی چنانچہ متاثر ہوئے ——— مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ علامہ اقبال محض مقلد تھے۔ یہ یک رنگی، اسلوب اور آہنگ کی یک رنگی تھی[1] ——— عمومی جذبات و احساسات انسانی کے اظہار کی حد تک مماثلت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ہم آہنگی یا بعض زاویوں کی مماثلت تقلید نہیں ——— ہم نے گزشتہ اوراق میں بعض جگہ بتایا کہ یہاں علامہ اقبال نے مثلاً نظیری کا ساتھ دیا ہے یا حافظ کی رفاقت کا لطف اٹھایا ہے اور یہاں جدا ہو گئے ہیں۔ اس جدائی کا باعث کہیں تو کسی معاصر کشمکش کا ذکر اور اثر تھا اور کہیں اپنے مخصوص نظریات پر اپنے مخصوص ایما و اشارہ کی مدد سے زور، اس لیے ہم نے ایک سے زیادہ بار یہ عرض کیا کہ اگرچہ علامہ اقبال کے بہت سے اشعار فرداً فرداً کلاسیکی فارسی غزل کے "حسین" اوسط" کا حصہ ہیں لیکن بالعموم جب ساری غزل دیکھیں تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہ علامہ اقبال کی ملکیت ہے۔

اس طرح "اجتماعیت" میں گم رہ کر بھی انفرادیت کے تحفظ کا اصول اور تجربہ سامنے آجاتا ہے۔ ہاں لبطور استثنیٰ دو ایک غزلیں ایسی بھی نکل آئیں گی جو پوری کی

---

[1] وقتی میگویم "تقلید" مراد ازاں اسلوب و قالب شعری است، ورنہ فکر و احساس کہ در سخن اقبال است تقریباً تازہ و بدیع میباشد (اقبال در راہِ مولوی ——— از ڈاکٹر محمد اکرم صفحہ ۱۱۳)

پوری مولانا روم یا نظیری یا عرفی یا حافظ کے دیوان میں داخل کی جا سکتی ہیں مگر استثنیٰ بہر حال استثنیٰ ہے۔ ایسی غزلیں پیامِ مشرق میں ہیں، زبورِ عجم میں رنگِ اقبال نمایاں تر ہے ——— علامہ اقبال قدیم بھی ہیں اور جدید بھی ——— بلکہ ان کے نزدیک قدیم و جدید کی بحث ہی غلط ہے۔

ے زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم!

ٹی ایس ایلیٹ نے اپنی نظم "Burnt Norton" میں کچھ ایسا ہی اظہارِ خیال کیا ہے:

"And the end and the biginning were always there"
"Before the biginning and after the end"
And all is always now"

بقول علامہ اقبال جو شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہے وہ اس حد تک جدید ہے اور بس۔ اس ضمن میں ان کے ایک خط سے چند جملے سطورِ سابق میں درج ہو چکے ہیں ———

یوں اگر دیکھیں تو علامہ اقبال کی طبیعت میں عصری علوم، عصری سیاست، عصری مذہبیات، عصری نظریات، وغیرہ نے کچھ ایسے عوامل پیدا کر دیے تھے جو اُن کی شاعری پر اثر انداز ہوتے رہے اور وہ اثر اندازی کبھی تائید کی شکل میں اور کبھی تردید کی صورت میں جلوہ گر ہوتی رہی۔ تردیدی عمل نسبتاً زیادہ رہا جس کا واضح سبب یہ ہے کہ علامہ اقبال دورِ معاصر کی مادہ پرستانہ رُوح سے بیزار تھا۔ اس سے آدم جوہرِ آدمیت سے محروم ہو کر حیوانیت کی سطح پر اُتر آیا تھا۔ جسدِ علم و تحقیق پر مادّی

نقطۂ نظر مادی تھا اور بدقسمتی سے اہلِ مغرب اپنی قوت کے باعث اہلِ مشرق پر مسلط ہو گئے تھے اور اہلِ مشرق احساس کمتری میں مبتلا ہو جانے کے باعث مادہ پرستی ہی کو اپنا بہترین اقدار اور ہتھیار جاننے لگ پڑے۔ اس لیے کہ تاثیر اور ردِ عمل میں اعتدال لازم نہیں۔

اہلِ مشرق میں اہلِ اسلام بھی شامل تھے جو روسی، انگریزی، فرانسیسی، ولندیزی اطالوی اور ہسپانوی استعمار کا شکار ہو گئے تھے۔ ان غلاموں کو جگانا اور ان میں مقاومت کی رُوح پیدا کرنا علامہ اقبال نے اپنا فرض گردانا۔ واضح رہے کہ مسلمان کو حریت کی راہ پر مسلمان کی حیثیت سے گامزن ہونا چاہیے تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی نظریں فرنگی سطوت کو دیکھ کر اہلِ فرنگ کے تمدن سے بھی مرعوب نہ ہو جائیں اور انہی کے ظاہری اسلوب کو اپنا کر آزادی حاصل کرتے کرتے انہی کے نظریات کے رنگ میں نہ رنگے جائیں۔ وہی میخانے، وہی رقص گاہیں، وہی مادی ہوس، وہی ارضی قومیت، وہی نسلی ولسانی تعصب وتفاخر، یہ زہرناک عناصر اگر مسلمان بھی قبول کرلیں تو گویا ان کو نیم سیاسی آزادی تو حاصل ہو جائے گی مگر رُوح اور ضمیر بدتر غلامی میں مبتلا ہو جائے گا۔

علامہ اقبال نے تہذیبِ فرنگ کو جھوٹے نگوں کی تابناکی قرار دیا اور اس سوسائٹی کو شاخِ نازک پہ بننے والا آشیانہ قرار دیا، علامہ اقبال دیکھ رہے تھے کہ مادہ پرستانہ رُوح نے جنگِ زرگری اور تن پروری کی جو طرح ڈالی ہے وہ مغرب کو لے ڈوبے گی۔ ایسا نہ ہو کہ مغرب کی تقلید میں مشرق والے بھی مارے جائیں۔ بالخصوص مسلمانوں کی جانب سے خطرہ تھا کہ وہ اپنے رُوحانی سرمائے ہی سے ہمیشہ کے لیے محروم نہ ہو جائیں لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کی مُردہ خودی کو بیدار کرنے کی خاطر شعر کو صورِ اسرافیل بنا لیا۔

بعض اوقات انھیں اس مقصد کی خاطر پرانے الفاظ کو نئے معانی دینے پڑے۔ پرانے اشارے کو نئے مشارٌ الیہ سے ہمکنار کرنا پڑا اور پرانی رمز کو نیا مروز دینا پڑا۔ ساتھ ہی کچھ نئی اشاریت اختراع بھی کی۔ کچھ مضمون پرانے ہی رہے، مگر اظہار کا پیرایہ نیا ہو گیا ــــــ نتیجہ یہ نکلا کہ مشرق و مغرب کی آویزش، علوم مغرب کی اساس اور اس کے اثرات سے بیزاری بلکہ ہر اس شے سے جو، جزٔ انحطاط ہو، مشرقی ہو خواہ مغربی، عربی ہو خواہ عجمی، احتساب کی تلقین، علم و فن کے زندگی سے دُور، اور تعمیرِ زندگی کے باب میں مُضر ہونے پر طعن، رُوحِ اسلام کی جانب رجوع، تعمیرِ اخلاقِ آدمیت، خودنگری بھی اور ایثار بھی، عقل محض سے احتراز، اور اس عقل سے مستنیر ہونے کی آرزو اور تلقین جو عشق، جنوں اور وجدان کی ہمقراں ہو۔ خوش آئند دَور کی خوش خبری، مدرسہ و خانقاہ کی فرسودہ رُوح کے خلاف بغاوت، شاہی و سلطانی سے نفرت، سراغ و جستجوئے پیہم، فقرِ غیور، شکوہ بحضورِ یزداں، التجا بحضورِ رسالت مآبؐ، نازِ بندگی، لذّتِ جدائی، نادرہ کاری، جدت پسندی، فرشتے پر آدم کی فوقیت پر اصرار، دنیا کو آدم کے لیے دارِ عقاب نہیں دارِ امتحاں جاننا، جہانِ تازہ تر اور حسین تر اور وسیع تر کی تلاش، سخت کوشی اور انفرادی ذمہ داری کی ترغیب و تعلیم وغیرہ کی قبیل کے مضمون علامہ اقبال کی شاعری کا لازمی جزو بنتے گئے۔ چنانچہ غزل بھی متاثر ہوئی۔ اب یہ کمالِ فن علامہ اقبال کا تھا کہ ان بظاہر مخالفِ مزاجِ غزل مضامین کو اس طرح بیان کیا کہ وہ غزل کی جان بن گئے ــــــ سچ ہے "قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل" ــــــ ان مضامین میں لالہ، لالۂ صحرائی، عقابی، شاہینی، کلیمی، براہیمی، جہانگیری، چنگیزی وغیرہ کلمات بھی اصطلاح کے روپ میں جلوہ نما اور کارفرما ہوئے۔ مقصد یہ کہ علامہ اقبال کی غزل کلاسیکی

ہونے کے باوصف ان جملہ بیان کردہ خصائص کے باعث جدید بھی ہے کہ وہ جدید دَور کے ردّالفعل اور عکس ورعکس کی مالک ہے ـــــ اور یہی وہ خصائص ہیں جن کی بنا پر ان کے بہت سے اشعار کسی بھی دوسرے فارسی شاعر کے کلام میں ضم نہیں ہو سکتے وہ بتاتے رہیں گے کہ ہم اقبال کے جگر پارے ہیں۔ اس طرح یک رنگی میں انفرادی پرتَو کی لہریں مستقلاً نظر افروز رہیں گی۔ ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان تازہ اور گوناگوں مسائل و معاملات کو مُتغزّلانہ بیان و اظہار عطا کر کے علامہ اقبال نے غزل کے دامنِ امکانات کو کتنا وسیع ثابت کر دیا ہے۔ اب علّامہ اقبال کے اُن اشعار کا نمونہ دیکھیے جو اقبالی ہیں اور صرف اقبالی۔

؎ خود را کنم سجودے دیر و حرم نماندہ
ایں در عرب نماندہ، آں در عجم نماندہ

؎ گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

؎ ایں آہ جگر سوزے در خلوت صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

؎ بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو!
کہ نیرزد بجوئے ایں ہمہ دیرینہ و نو!

آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختہ ای
ہم بہ جبریلِ امینے نتواں کرد گرو

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزلخوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است

شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہہ و حکیم!
اگرچہ نخل بلند است برگ و بر ندہد

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاریہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند

درا بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب
کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی
بحیرتم کہ نہ بینی قیامتِ موجود

ہونے کے باوصف ان جملہ بیان کردہ خصائص کے باعث جدید بھی ہے کہ وہ جدید دَور کے ردّ الفعل اور عکس و برعکس کی مالک ہے ـــــ اور یہی وہ خصائص ہیں جن کی بنا پر ان کے بہت سے اشعار کسی بھی دوسرے فارسی شاعر کے کلام میں ضم نہیں ہو سکتے وُہ بتاتے رہیں گے کہ ہم اقبالؔ کے جگر پارے ہیں۔ اس طرح یک رنگی میں انفرادی پرتَو کی لہریں مستقلاً نظرافروز رہیں گی۔ ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان تازہ اور گوناگوں مسائل و معاملات کو متغزّلانہ بیان و اظہار عطا کرکے علاّمہ اقبال نے غزل کے دامن امکانات کو کتنا وسیع ثابت کر دیا ہے۔ اب علاّمہ اقبال کے اُن اشعار کا نمونہ دیکھیے جو اقبالی ہیں اور صرف اقبالی۔

ے خود را کنم سجودے دیر و حرم نمانده
ایں در عرب نمانده، آں در عجم نمانده

ے گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

ے ایں آہ جگر سوزے در خلوت صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

ے بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو!
کہ نیرزد بجوئے ایں ہمہ دیرینہ و نَو!

؎ آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ
ہم بہ جبریلِ امینے نتواں کرد گرو

؎ غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزلخوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است

؎ شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہہ و حکیم!
اگرچہ نخل بلند است برگ و بر ندہد

؎ فروغِ آدم خاکی ز تازہ کاریہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

؎ چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیر آستیں کردند

؎ درا بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب
کہ روز فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

؎ سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی
بحیرتم کہ نہ بینی قیامتِ موجود

ہ

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

ہ

نغمہ پردازی ز جوئے کوہسار آموختم
در گلستاں بودہ ام یک نالہ درد آلودے

ہ

فرشتہ را دگر آں فرصت بسجود کجاست
کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند

ہ

آدم کہ ضمیر او نقش دو جہاں ریزد !
بالذت آہے ہست بے لذت آہے نیست

ہ

اگر در دل جہانے تازہ داری بروں آور
کہ افرنگ از جراحتہائے پنہاں بسمل افتاد است

ہ

ذرۂ بے مایۂ ترسم کہ ناپیدا شوی !
پختہ تر کن خویش را تا آفتاب آید بروں

ہ

دُرد من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست
پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

ﮯ

نغمۂ عافیت از بربط من مے طلبی
از کجا بر کشم آں نغمہ کہ در تارش نیست

ﮯ

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی
در دلِ خاک فرو رفت و بدریا نرسید
از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگرِ بحر شگافید و بہ سینا نرسید

ﮯ

من کہ رمزِ شہریاری با غلاماں گفتہ ام
بندۂ تقصیر دارم پیشِ سلطانم برید

ﮯ

در نہادِ عشق با فکرِ بلند آمیختند
ناتمام جاودانم کارِ من چوں ماہ نیست
حجرۂ شاہینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پر کشا، پرواز تو کوتاہ نیست

ﮯ

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بودہ است
زمیں بہ پشتِ خود الوند و بیستوں دارد
غبارِ ماست کہ بر دوشِ اُو گراں بودہ است

ے

عرب کہ باز دہد محفل شبانہ کجاست
عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجاست
دریں چمن کدہ ہر کس نشیمنے سازد
کسے کہ سازد و وا سوزد آشیانہ کجاست

ے

کشائے چہرہ کہ آنکس کہ لن ترانی گفت
ہنوز منتظرِ جلوۂ کفِ خاک است

ے

امیرِ قافلہ سخت کوش و پیہم باش
کہ در قبیلۂ ما حیدری ز کراری است

ے

اے لالۂ صحرائی تنہا نتوانی سوخت
ایں داغِ جگر تابے بر سینۂ آدم زن!

ے

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت
نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید برون

ے

خوشا کسے کہ فرو رفت در ضمیرِ وجود
سخن مثالِ گہر بر کشید و آساں گفت

ـــہ زعلم و دانش مغرب ہمیں قدر گویم !
خوش است آہ و فغاں تا نگاہ ناکام است

ـــہ حیات چیست، جہاں را اسیر جاں کردن
تو خود اسیر جہانی، کجا توانی کرد !

ـــہ بر دلِ آدم زدی عشق بلا انگیز را
آتشِ خود را بہ آغوش نیستانے نگر

ـــہ عزم ما را بہ یقیں پختہ تر کن ساز کہ ما
اندریں معرکہ بے خیل و سپاہ آمدہ ایم

ـــہ قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

ـــہ زجوہرے کہ نہاں است در طبیعت ما
مپرس صیرفیاں را کہ ما عیار خودیم

ـــہ نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می برم ناقۂ بے زمام را

ے اگر یک ذرّہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
بایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را

ے مہ و انجم از تو دارد گلہ ہا شنیدہ باشی
کہ بخاکِ تیرہَ ما زدہٖ شرارِ خود را

ے پیدا ستیزد، پنہاں ستیزد
ناپائدارے با پائداراں!

ے ہر چند زمیں سائیم، برتر ز ثریا ائیم
دانی کہ نمی زیبد عمرے چو شرر مارا

ے نگردد زندگانی خستہ از کارِ جہانگیری
جہانے را گرہ بستم، جہانے دیگرے پیش است

ے مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر!
ز نوری سجدہ میخواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

ے در جہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں!

ے بجلال تو در دل دگر آرزو ندارم !
بجُز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی !

ے تپیدن و نرسیدن چہ لذّتے دارد
خوشا کسے بہ دنبالِ محمل است ہنوز

ے نہ ایں جا چشمکِ ساقی نہ آنجا حرفِ مشتاقی
ز بزم صوفی و مُلّا بسے غمناک می آیم

ے مکدّر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی

ے باچُنیں زورِ جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

ے آں فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ، از فرّ فریدوں بہ
در دیرِ مُغاں آئی مضمونِ بلند آور
در خانقہ صوفی افسانہ و افسوں بہ

ے تکیه بر عقلِ جہاں بین فلاطون نکنم!
درکنارم دلکے شوخ و نظربازے ہست

ے بشکوهِ بے نیازی ز گدا نگاں گذشتم
صفتِ مہِ تمامے کہ گذشت بر ستاره

ے ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنه کام
خونِ حجاز باز ده کوفه‌ و شام خویش را

ے آنکس کہ بہ سر دارد سودائے جہانگیری!
تسکینِ جنونش کُن با نشترِ چنگیزی

ے زباده‌ کہ بخاکِ من آتشے آمیخت
پیالهٔ بجوانانِ نَو نیاز آور

ے غنچهٔ دل گرفته را از نفسم گره کشا!
تازه کُن از نسیمِ من از مہ و مہر و مشتری

ے شبے بہ میکده خوش گفت پیرِ زنده دلے
بہ ہر زمانہ خلیلؑ است و آتشِ نمرود

ے
خرد افروخت مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ے
بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفاطلبیست
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
اگر نہ بوالہوسی با تو نکتہ گویم!
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است

ے
رمزِ حیات جوئی جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را

ے
آفرید اگر شبنم بے مایہ ترا
خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز

ے
حنا ز خونِ دلِ نوبہار می بندد
عروسِ لالہ چہ اندازہ تشنۂ رنگ است
بلندتر ز سپہر است منزلِ من و تو
براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است

جُرمِ ما از دانهٔ و تقصیرِ اُو از سجدهٔ!
نے بآں بیچاره می سازی نه با ما ساختی
طرحِ نَو افگن که ما جدّت پسند افتاده ایم
ایں چه حیرت خانهٔ امروز و فردا ساختی

من فقیرِ بے نیازم مشربم ایں است و بس
مومیائی خواستن نتواں شکستن می تواں

از خاکِ سمرقندے ترسم که دگر خیزد
آشوبِ هلاکوئے، هنگامهٔ چنگیزے

نقشِ دگر طراز ده آدمِ پخته تر بیار!
لعبتِ خاک ساختن می نه سزد خدائے را

دل و دیں در گرو زهره وشاں عجمی
آتشِ شوقِ سلیمیٰ نه تو داری و نه من

در عشق غنچه ایم که لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خاره ایم

ے نشود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تاب زندگانی بتو آشکار بادا

ے نظر تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی
نرسی بجز بہ تقاضائے کلیم اللٰہی !

ے گرفتم ایں کہ کتاب خرد فرو خواندی
حدیثِ شوق نہ فہمیدۂ دریغ از تو

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

——— اقبال

سبکِ اقبال

گویا علامہ اقبال عظمائے غزل فارسی کے کاروانِ عالی شان میں شامل رہ کر بھی اپنے خیمہ و خرگاہ کو عظمت و زینت کے بعض خصائص کے باعث ممیز و منفرد رکھتے ہیں اور بلا تجسس ان کا مقام پہچان لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال کو نہ تو کسی ایک شاعر کا ضمیمہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی ایک خاص سبک کا پابند۔

علامہ اقبال کی غزلوں میں سارے سبک موجود ہیں اور وہ مل جُل کر ایک نیا سبک بن جاتے ہیں جسے "سبک اقبال" کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم نے الفتنۃ الکبریٰ میں اسلامی نظامِ حکومت پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ اسلام کے نظام کو جمہوریت بتایا جاتا ہے ہاں وہ اس اس حد تک جمہوریت ہے مگر اس سے آگے نہیں ــــــ بعض لوگ اسلام کے نظامِ حکومت کو ڈکٹیٹرشپ قرار دیتے ہیں ہاں وہ اس اس معنیٰ میں ڈکٹیٹرشپ ہے مگر اس سے آگے نہیں۔ اسلامی نظام کو اشرافیہ (ارسٹاکریسی) بھی شمار کیا جاتا ہے اور حکومتِ الٰہیہ (تیاکریسی) بھی، مگر وہ اس اس حد تک اشرافیہ ہے اور اس اس مفہوم میں حکومتِ الٰہیہ ہے اس سے آگے نہیں ۔۔۔۔ چنانچہ مختلف اسالیب حکومت سے بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اسلام کا نظام نہ یہ ہے نہ وہ، وہ خود اپنی

خود اپنی ذات میں ایک نظام ہے، نظامِ اسلام اور بس ..... بالکل یہی مثال علامہ اقبال کے سبک (اسلوب) پر صادق آتی ہے، وہ نہ سبک ہندی میں سماتے ہیں۔ نہ سبک خراسانی میں اور نہ سبکِ عراقی میں، میرے اس دعوے کو ڈاکٹر خلیلی جیسے عالی پایہ نقاد اور ادیب کی رائے حوصلہ افزا تقویت دیتی ہے، ڈاکٹر خلیلی کے الفاظ یہ ہیں۔

"اگر خواستہ باشیم سبک اشعار علامہ اقبال لاہوری را در چند کلمہ خلاصہ کنیم بگوییم ایں شاعر سبکے مخصوصے بخود نداشت کہ شاید مناسب باشد آنرا بنام "سبک اقبال" بخوانیم ——— اقبال بعکس آنچہ ممکنست در بادیٔ امر تصور شود کمتر بسبک ہندی متوجہ بودہ وازاں اقتباس و پیروی کردہ است، بلکہ با مطالعہ و تتبع در اشعار شعرائے قدیم ایران از قبیل منوچہری، و ناصر خسرو و سنائی و عطار و مولوی و سعدی و حافظ و جامی بیشتر روش آناں را در شعر و شاعری بکار می برد و حدود سبک خود را ہماں پایہ اسالیبِ قدیم شعر فارسی نگاہ میداشت[۱]"

مگر یہ حقیقت اپنی جگہ بہر حال موجود ہے کہ ایران کے جوان نقادوں اور ادیبوں کی اکثریت علامہ اقبال کی شاعری کو بیگانہ اور اجنبی جانتی ہے ...... اور یہ ایرانی نوجوان اہلِ قلم ہی کا المیہ نہیں علامہ اقبال خود اپنے وطن میں بیگانہ اور پردیسی ہیں۔ فارسی اور عربی کا ذوق ختم ہو گیا، فارسی اور عربی کو قومی زبان اُردو کو ترقی و تقویت دینے کے جوش و خروش نے پاکستان سے نکال باہر کیا، یہ الگ بات ہے کہ مغربی پاکستان میں جہاں اُردو قومی زبان ہے وہاں خود اُردو کو بھی چین نہیں لینے دیا گیا۔ خطرہ ہے کہ علاقائی زبانیں ایک روز اُردو زبان سے اُس زیادتی کا انتقام لیں گی جو اُردو سے عربی اور فارسی کے باب میں سرزد ہوئی۔

---

[۱] اقبال ایرانیوں کی نظر میں، از ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی۔ صفحہ ۱۳۴

وہ روز روزِ بدنصیبی ہوگا،

یہ تو واضح ہے کہ جب علّامہ اقبال نے فارسی میں شعر کہنے شروع کیے تھے اس زمانے میں زبانِ فارسی برِعظیم پاک و ہند میں ایک نہایت معروف زبان تھی جسے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی سب قوموں کے افراد پڑھتے تھے۔ فارسی ان صوبوں کی بھی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی جہاں اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ فارسی کا دائرہ تنگ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ علّامہ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ جو فارسی میں ہے غیر ملکی اور غریب الدّیار ہو کر رہ گیا مگر اسی پر کیا بس ہے۔ کیا ہمارا آج کا نیا ادیب "بال جبریل" سے لطف اٹھا سکتا ہے؟ یا آج وہ بانگ درا کی نظم "خضر راہ" اور "طلوعِ اسلام" میں ڈوب سکتا ہے؛

نئے ادیب پس منظر سے کٹ کر اور اصطلاح و اشارہ اور تلمیح و مجاز کی تعبیراتِ گوناگوں سے ناواقف ہونے کے باعث علّامہ اقبال کے اردو کلام کو بھی فقط سونگھ سکتے ہیں اور پھر داد کے طور پر ناک سکیڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظر میں علّامہ اقبال مشکل پسند، تضاد کا شکار، قدامت پسند اور نہ جانے کیا کیا ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ ہمت کس میں اور اس محنت کے لیے فرصت کس کے پاس کہ ان کے علمی سرچشموں تک پہنچیں اور حقائق و مسائل اور عقائد و نظریات کی لم تک رسائی حاصل کریں جہاں سے علّامہ اقبال نے فیض اور اثر حاصل کیا۔ آج کا سہولت پسند نقاد اور ادیب خود بلند ہو کر کسی عالی پایہ صاحبِ فکر و نظر اور صاحبِ کمالِ فن تک نہیں پہنچنا چاہتا۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اوپر والوں کو اپنی نچلی سطح پر کھینچ لائے۔

علّامہ اقبال کی فارسی شاعری کے بارے میں ایرانی نوجوان روشن خیالوں کو بھی یہی دقّت پیش آتی ہے۔ اس دِقّت کا حل علم ہے نہ کہ محض "مادری زبان" پر ناز ——

اس بارے میں ڈاکٹر عرفانی کے الفاظ ذیل جو درحقیقت ملک الشعرائے بہار کے ارشادات ہیں خاصی رہبری کرتے ہیں۔ خود حضرت ملک الشعراء بہار، علّامہ اقبال کے جس حد تک ۱۷۴

تھے وہ ان کے ایک مصرعہ ہی سے ظاہر ہے۔

"عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت"

ڈاکٹر عرفانی لکھتے ہیں" بہار کہنے لگے کہ اقبال، رومی، حافظ یا سعدی یا ہر بڑے شاعر کے کلام کو سمجھنے اور اس سے لطف اٹھانے کے لئے اپنے پاس بھی کچھ فکری، معنوی اور تاریخی ذخیرہ ہونا چاہیئے۔ یہ جوان ادیب اور شاعر اپنی محدود نگاہ اور سلیقے کے ذریعے ان کی جامع شخصیت اور وسیع مطالعات کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال نے بعض ایسے مطالب اور نکتے اور نظریات بیان کئے ہیں جو اس سے پہلے فارسی زبان میں نہیں پائے جاتے۔ اس لئے اقبال کا کلام کم مطالعہ اور نیم خواندہ لوگوں کو نامانوس ہی نہیں بلکہ غیر قابل فہم معلوم دیتا ہوگا۔ پھر مسکرا کر کہا نہ صرف اقبال کا کلام بلکہ سنائی، عطار، رومی، فرخی اور خاقانی ——— سب کا کلام ان کے لئے غیر مانوس اور ثقیل ہے، اور کہا میں نے اقبال کا سارا کلام پڑھا ہے۔ لیکن مجھے کوئی غلطی نظر نہیں آتی"[1]

حق یہ ہے کہ ملک الشعراء بہار مرحوم نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ جوان ایرانی ادیب تو خود اپنے بزرگوں، سنائی، رومی، اور عطار وغیرہ کے کلام کو ثقیل جانتے ہیں، علامہ اقبال کا کیا قصور، پھر علامہ اقبال ہیں کہ بعض نئے مطالب، نئے نکات اور نئے نظریات قلمبند کر رہے تھے جن سے طبیعتیں آشنا نہ تھیں۔

سخن تازہ زدم کس بہ سخن وا نرسید ؎
جلوہ خون گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید

علامہ اقبال کا یہی نیا پن ہے جو لوگوں کے کلاسیکی اندازِ بیان کے باوصف انہیں منفرد

---

[1] اقبال ایرانیوں کی نظر میں صفحہ ۱۱

اور الگ رکھتا ہے جیسا کہ ان بہت سے اشعار کی بدولت واضح ہوتا ہے جو باب سابق میں درج کئے جا چکے ہیں۔ فقط اشعار ہی کی بات نہیں، بہت سی پوری کی پوری غزلیں ایسی ہیں جو کسی دوسرے شاعر کے دیوان میں سما نہیں سکتیں ——— اور ایسی غزلیں زبور عجم میں زیادہ ہیں۔ اور ان میں سے بہت سی علامہ کی اپنی زمینوں میں ہیں۔ مثال کے طور پر

~ ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است!
جلوۂ او گرو دیدہ بیدار من است!

~ لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز!!
سپر از دست مینداز کہ جنگ است ہنوز!

~ عرب کہ باز دہد محفل شبانہ کجاست!!
عجم کہ زندہ کند رود عاشقانہ کجاست!

~ لالۂ صحرایم از طرف خیابانم برید!!
در ہوائے دشت و کہسار و بیابانم برید

~ سخن تازہ زدم کس بہ سخن وا نرسید
جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید

ــ دریں چمن دلِ مرغانِ زماں زماں دگر است
بشاخ گل دگر است و بہ آشیاں است

ــ کشادہ رو ز خوش و ناخوشِ زمانہ گذر
زگلشن و قفس و دام و آشیانہ گذر

ــ بروں زیں گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے!
کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحر گاہے!

ــ فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

ــ مئے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست!
پیشِ صاحب نظراں حور و جناں چیزے نیست

خود را کنم سجودے دیر و حرم نماندہ
ایں در عرب نماندہ آں در عجم نماندہ

وغیرہ وغیرہ۔

اور تو اور بعض غزلیں ایسی بھی ہیں کہ معروف و مقبول آہنگ کے ساتھ کسی بزرگ و پیشوا کے رنگ میں شروع ہوتی ہیں مگر پڑھتے جائیے، مضمون اور مقصد کچھ سے کچھ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس تسلسل اور ترتیب کے ساتھ کہ غزل اچھی خاصی نظم معلوم ہونے لگتی ہے۔ غزل ذیل حافظ کے مزاج کا پرتو دکھائی دیتی ہے مگر کہتی کیا ہے اور کس تدریج کے ساتھ۔

ے

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند!!
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند!
بخلوت اند زمان و مکاں در آغوشند

بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر!!
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

نظام تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند!
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

زمانہ از رُخِ فردا کشود بندِ نقاب!!
معاشراں ہمہ سرمست بادہ دوشند

بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت
بحیرتم کہ فقیہان شہر خاموشند!!

اسی طرح نظیری کی زمین میں کہی جانے والی یہ غزل دیکھیے:۔

زرسم و راہ شریعت نکردہ ام تحقیق!
جزانیکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق!

مقامِ آدمِ خاکی نہاد دریابند!
مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق!

من از طریق نہ پُرسم رفیق میجویم!
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق

کند تلافیٔ ذوق آنچناں حکیم فرنگ!
فروغ بادہ فزوں تر کند بجام عقیق!

ہزار بار نکوتر متاع بے بصری!
ز دانشے کہ دل او را نمی کند تصدیق

بہ پیچ و تاب خرد گرچہ لذت دگر است!
یقیں سادہ دلاں بہ ز نکتہ ہائے دقیق!

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فروشستم!
ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق!

ز آستانہ سلطاں کنارہ می گیرم!
نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق!

پیام مشرق میں ایک غزل دسمبر ۱۹۱۴ء کی ہے اور پھر ۱۹۱۵ء سے جو یہ سلسلہ شروع ہوا تو ۱۹۲۲ء تک چلا گیا۔ پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں چھپ گئی تھی۔

زبور عجم کی غزلوں کا تعلق ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک کے عرصے سے ہے۔ ممکن ہے اس کتاب میں بعض غزلیں پیام مشرق کے دور کی بھی ہوں جو کسی وجہ سے اس مجموعے میں شامل نہ ہوئی ہوں۔ زبور عجم جنوری ۱۹۲۷ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ جیساکہ سطور ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

"زبور ختم ہو گئی ہے۔ ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ چلی جائیگی اور پندرہ دن کے اندر اندر شائع ہو جائے گی۔ اس کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں انسان کا راز و نیاز خدا کے ساتھ، دوسرے حصے میں آدم کے خیالات آدم کے متعلق، طرز دونوں کی غزلیات کے موافق، یعنی الگ الگ غزل نما ٹکڑے ہیں تیسرے حصے میں گلشن راز (محمود شبستری) سوالوں کے جواب ہیں۔ اس کا نام میں نے گلشنِ راز جدید رکھا ہے۔ چوتھے حصے میں ایک مثنوی ہے جس کا نام میں نے بندگی نامہ تجویز کیا ہے" [1]

یہ خط ۳۱ جنوری کا مورخہ ہے ——— "زبور عجم" جون ۱۹۲۷ء میں چھپی۔ دس پندرہ روز کے اندر شائع نہ ہو سکی۔ جیساکہ علامہ اقبال کا خیال تھا اور جب چھپی تو اس خط کے مخاطب یعنی مولانا گرامی وفات پا چکے تھے ——— وہ مئی میں اللہ کو پیارے ہو گئے ——— اس خط میں ایک بات بڑی توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ علامہ اقبالؒ نے زبور عجم کی غزلوں کو، بحضور آدم اور بحضور یزداں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور انہیں غزلیات نہیں کہا بلکہ "غزلیات کے موافق یعنی" الگ الگ غزل نما ٹکڑے" قرار دیا ہے۔

---

[1] مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۲۴۱

گویا ان کے ذہن میں دونوں حصوں میں بیان کی جانے والی غزلوں کا مضمون اور قافیہ ایک تھا اور مسلسل تھا جو الگ الگ ٹکڑوں میں پیش کیا گیا۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ان کے نزدیک ان کی غزلیں عام فارسی روایتی غزل سے از روئے مراد و مقصود مختلف قرار پاتی ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو عام غزل نگاروں اور غزل خوانوں سے مختلف جانتے تھے۔ حتیٰ کہ بحضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فریاد پیش کی۔

من اے میر امم داد از تو خواہم!
مرا یاراں غزل خوانے شمردند!

یہ الگ بات ہے کہ کبھی خود بھی غزل کہنے کا اقرار کیا ہے اور غزل کہہ کے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہے۔ مگر بھڑاس نہیں نکل سکتی۔

غزلے زدم کہ شاید زنوا قرار یابم
تب شعلہ کم نگردد ز گسستن شرارہ

اور کبھی یہ بتایا ہے کہ میں غزلوں میں اپنا سوزِ دل شامل کر رہا ہوں۔ چنانچہ وہ سراپا تپش ہیں۔ وہی اصحاب ان غزلوں سے لطف یاب ہو سکتے ہیں۔ جو خود جلے ہوئے ہیں۔ مگر وہ جن کی سوزش خام ہے۔ ان کے لئے دعا کرتے ہیں کہ میری غزل انہیں سازگار آئے۔

تو جوانِ خام سوزے سخنم تمام سوزے!!
غزلے کہ می سرایم بہ تو سازگار بادا

مگر ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کی غزل عام غزل نگاروں سے مختلف ہے اور پھر عام غزل نگار غزلخواں بھی تو ہیں۔ علامہ اقبال غزلخواں کہلانے سے گھبراتے تھے جوں جوں وقت

گزرتا گیا۔ وہ شعر سُنانے سے ابا کرتے چلے گئے۔

بہر حال علامہ اقبال کی یہ غزلیں جس مزاجی ہم آہنگی اور وحدت تاثر کی مالک ہیں اس اعتبار سے ہم انہیں "غزل نما" ہی کہیں گے۔ تقریباً یہی عالم پیام مشرق کی غزلوں کا ہے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ زبورِ عجم میں آہنگِ مولانا روم کا حصہ زیادہ نمایاں ہے اور پیام مشرق میں آہنگِ حافظ و نظیری نسبتاً زیادہ کارفرما ہے۔ ویسے تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ کسی شاعر کا دوسرا مجموعۂ کلام پہلے سے اور تیسرا مجموعۂ کلام دوسرے سے فنی اور فکری اعتبار سے ضرور بہتر ہو۔ ہم نے ایسے کئی حضرات الشعراء دیکھے ہیں جن کا پہلا نقش ہی بہترین تھا اور ازاں بعد آنے والے خاکے بے رنگ رہے۔ مگر زبورِ عجم میں نغمگی اور متانت کے ساتھ ساتھ فکری بلندی بھی پیام مشرق کے مقابل زیادہ ہے۔ اگرچہ پیام مشرق اور زبورِ عجم کے مابین کوئی مدت حائل نہیں یعنی مزاج کا ایک رنگ، اور طبیعت کا رُخ متعین ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس عالم میں جو غزلیں ۱۹۲۲ء کے آخر تک ہو گئیں وہ پہلی کتاب کی زینت بنیں، اور جن کا سلسلہ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں جا کر ختم ہوا وہ دوسری کتاب کی رونق بنیں، گویا ایک سلسلہ جاریہ تھا۔ انقطاع رونما نہیں ہوا۔ ہاں سوز دروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دل ساتھ کے ساتھ گداز تر ہوتا چلا گیا۔ اور نغمہ پرسوز تر لے اختیار کرتا چلا گیا۔ یہ تن کی گرمی نہ تھی، یہ من کی گرمی تھی۔ اسے بڑھنا ہی چاہیئے تھا۔ سب سے آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" کے قطعات اس امر پہ شاہد عادل ہیں انہیں داغ کی طرح یہ نہیں کہنا پڑا کہ اب ہجر کے اوقات کوئی کتاب یا اخبار دیکھ کر کٹتے ہیں۔ علامہ اقبال کے من کی کائنات تو ایک گلزار ابد بہار کی طرح تھی ؎

بہ چشم کم مبیں تنہائیم را ! کہ من صد کارواں گل در کنارم

یہاں مرزا عبدالقادر بیدل کا شعر ذیل ناگہانی طور پر یاد آتا ہے

ے بہ جیب تست اگر خلوتے و انجمنے است!!
بروں ز خویش کجا میروی جہاں خالیست

ہم ڈاکٹر خلیلی صاحب کی رائے اوراقِ سابق میں درج کر چکے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کو خود ان کی ذات میں ایک الگ مکتب جانتے ہیں اور ان کے اسلوب و انداز اور فکر و خیال کے مجموعہ مظاہر کو "سبکِ اقبال" قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی غزلِ فارسی کا معاملہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بحریں عموماً وہی قدیم ہیں جو مروج چلی آتی ہیں۔ بہت سے قوانی بھی وہی اختیار کئے جو دوسروں نے ان سے قبل اختیار کئے تھے۔ مگر جو کچھ بیان ہوا وہ مجموعی طور پر دوسروں سے جدا ہے۔ گویا ساغر پرانے ، مگر نیا ساقی نئے ذائقے یا ذوق کی صہبا پیش کر رہا ہے۔

ہمیں علامہ اقبال کی غزلیں عجمی صنعت اور عربی طبیعت' عجمی لباس' اور عربی مزاج کی مالک دکھائی دیتی ہیں۔

ع دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

عربی غزل کا مضمون عموماً مسلسل ہوتا ہے ——— عربی غزل کو قصیدے کی نسیب و تشبیب کی ضمنی حیثیت سے نجات دلا کر ایک آزاد صنف بنانے والوں کے سرخیل عمر بن ابی ربیعہ اور ان کے ایک دو دیگر معاصر تھے۔ عمر بن ابی ربیعہ بنو امیہ کے دور کا شاعر تھا۔ ایرانی شعراء صنفِ غزل کے موجد نہیں، ہاں انہوں نے ردیف کا ضرور اضافہ کیا۔ گو ردیف لازمۂ غزل نہ تھا۔ ہاں ردیف سے آہنگ و نغمہ کو جو چار چاند لگتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں ——— اور پھر یہ کہ ردیف صرف

غزل میں نہیں۔ ایرانیوں نے اسے ہر صنف میں برتا مگر عربی غزل ہمیشہ ان شعر پاروں کا مجموعی صنفی نام رہا جن میں عشق و محبت اور متعلقہ گوناگوں مضامین و کیفیات کا بیان و اظہار عمل میں آیا ہو ——— اس طرح ہر شعر پارے کا اس کے مضمون و مقصود کے مطابق بالکل ایسے ہی ایک الگ عنوان ہوتا تھا (اور تا حال یہی حال ہے) جیسے ہمارے یہاں نظم کا ——— ہم نظم کے اوپر عنوان کے طور پر خالی "نظم" نہیں لکھ دیتے جیسا کہ غزل کے بارے میں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے مافیہ کے تناسب سے کوئی مخصوص عنوان جماتے ہیں۔ "تصویرِ درد" "ہم سبق سے" "عاشق اور بڑھاپا" "بہار اور شباب" "رقاصہ" "رات اور ریل" وغیرہ الگ الگ عنوان قائم کرتے ہیں۔ مگر جب غزل نقل کرتے ہیں تو اس کا عنوان فقط "غزل" لکھ دیتے ہیں۔ غزل، غزل اور غزل۔ گویا کوئی ایک جذبہ یا مضمون یا کیفیت ایسی حاوی نہیں کہ اس شعر پارے کی شناخت بنے اور اس طرح عنوان قرار پائے۔

عربی میں ہر ایسا شعر پارہ بھی جو صنفِ غزل کا حصہ ہو اپنے کسی حاوی عنصر مضمون کے مطابق ایک عنوان کا مالک ہوتا ہے۔ گویا اس میں بھی ایک طرح کا تسلسل موجود ہوتا ہے ——— علامہ اقبال کی غزلوں کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں سمیت کئی اہلِ نظر نقادوں نے یہی کہا ہے کہ وہ نظم سے بہت قریب ہیں۔ اس کے برعکس ان کی نظموں میں بھرپور غزلیت موجود ہے ——— (تغزل دونوں جگہ ہے) بالفاظِ دیگر علامہ اقبال نے نظم و غزل کے مابین وسیع خلیج حائل نہ رہنے دی اور داخلیت و خارجیت کے فرضی و جعلی مفارقات و امتیازات کو اپنی نظموں اور غزلوں میں تقریباً ختم کر دیا۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو ان کا زبورِ عجم کی غزلوں کو غزل نما

"ٹکڑے" قرار دینا اور بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہ قول بڑی حد تک
پیام مشرق کی غزلوں پر بھی صادق آتا ہے اور "ٹکڑے" کا لفظ اس لئے بھی موزوں ہے
کہ علامہ اقبال نے کسی فارسی غزل کو طول نہیں دیا، شعروں کی تعداد
ہے اور اگر کوئی شعر خالص مصورانہ فن کاری یا عاشقانہ جذبات کی تشریح ہے تو وہ بھی
مرکزی مضمون کی گراں باری کو گوارا بنا دینے کی خاطر ہے۔ گویا مرکزی مضامین کو
تصویری حیثیت حاصل ہوتی ہے اور عاشقانہ حسنِ بیان کو دلآویز چوکھٹوں کی ڈاکٹر
شمل علامہ اقبال کی غزل کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان کی غزل کے شعر فرداً فرداً بھی
ایک اکائی کے طور پر لئے جا سکتے ہیں اور اس سے ان کی جاذبیت میں کوئی فرق نہیں
پڑتا۔ تاہم ان کا فلسفۂ خودی غزل کو بھی ایک طرح کی وحدت بنا دیتا ہے اور اسے تلقینی
قوت عطا کر دیتا ہے [1]

یہ فن اور ہم آہنگ مضامین کی آمیزش تو ان کی تقریباً ہر فارسی غزل میں موجود ہے
مگر بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں معنوی ربط اور تسلسل نمایاں تر ہے۔ مثلاً یہ غزل دیکھئے،
جس میں عظمتِ آدم کا نقش دلوں پر بٹھایا گیا ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست!
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو است!
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیام خویش!
گاہے درونِ سینۂ مرغان بہ ہا و ہوست!

---

[1] Gabrails Wing by Dr. A Schimmel P-69

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگو است
آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما
بیرون و اندروں زبر و زیر و چار سُو ست!
ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکیے
نظّارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بُو ست
پنہاں بہ ذرّہ ذرّہ و ناآشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب و بآغوشِ کاخ و کو ست
در خاکدانِ ما گہر زندگی گم است!
ایں گوہرے کہ گم شُدہ مائیم یا کہ اوست

اسی طرح پانچ شعر کی غزلِ ذیل دیکھیے۔ اس میں بھی عظمتِ آدم کا مضمون دہرایا گیا ہے ——— کیا غزل ہے۔

لالہ ایں گلستان داغ تمنّائے نداشت ؎
نرگسِ طنّاز او چشم تماشائے نداشت
خاک را موجِ نفس بود و ولے پیدا نبود
زندگانی کاروانے بود و کالائے نداشت
روزگار از ہاؤ ہُوئے میکشاں بیگانہ
بادہ در میناش بود و بادہ پیمائے نداشت

برق سینا شکوہ سنج از بے زبانیہائے شوق !
ہیچ کس در وادیٔ ایمن تقاضائے نداشت
عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد !
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

وعلیٰ ہذا القیاس ــــــــ

سطورِ سابق میں ہم ایک مقام پر اس امر کا ذکر کر چکے ہیں کہ وہ کون سے عصری مسائل و معاملات تھے جن کے عمل اور ردِ عمل نے علامہ اقبال سے نئے نئے مضامین کے شعر کہلوائے اور وہ کیا نظریات تھے جن پر انھیں اصرار تھا لہذا وہ تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ــــ ہم نے واضح کیا تھا کہ یہ اور اُن جیسے اور کئی موضوعات اور ان کے حسبِ تقاضا تراکیب، مجازات اور اشارے ہیں جو اُن کے بہت سے اشعار کو دُوسرے شعراء کی غزلوں میں ضم نہیں ہونے دیتے۔

ہم ان کلمات کو یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔ امتیازات کے بارے میں یاد دہانی ضروری تھی تاکہ جن باتوں کے باعث علامہ اقبال کی غزلیں قدیم فارسی غزل سے ہم آہنگ ہو کر بھی منفرد ہیں وہ ذہن میں تازہ رہیں اس لیے کہ

شرابِ میکدۂ من نہ یادگارِ جم است
فشردۂ جگرِ من بہ شیشۂ عجم است

رنگا رنگ مضامینِ غزل کی "ہم جہتی" کے باعث علامہ اقبال کی غزل میں ہم نے وحدت کے جلوے دیکھے، اس سے ایک نتیجہ خود بخود کھل کر نگاہوں کے سامنے آگیا کہ علامہ اقبال کی غزلیں فن برائے فن کی پیداوار نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو رنگا رنگ

ضرور ہوتیں مگر وحدت اور اکائی کا تاثر جادو نہ جگاتا۔ اور ظاہر ہے کہ شعر میں فن اور صنعت کے جلوے معنوی ربط اور موضوع کے حوالے کے بغیر محض لفظوں سے پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ سید عابد علی عابد کے الفاظ میں الفاظ کا حسن و قبح تشکیل و تعمیر موضوع کی نسبت سے واضح ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ مفردات الفاظ نہ سبک ہیں نہ ثقیل، نہ مترنم ہیں نہ مکروہ، صرف آوازیں ہیں اور معصوم، ان کی صوتی اہمیت صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ دوسرے الفاظ سے مل کر کسی معانی کی تشکیل میں اینٹ چونے کا کام دیتی ہیں" [۱]

فن برائے فن کے قائل حضرات اس مسئلے پر توجہ نہیں فرماتے یا یوں کہئے کہ کماحقہٗ توجہ نہیں فرماتے کہ ہر فن پارہ ایک ترکیبی وحدت ہے اور وہ وحدت ناقابل تقسیم ہے۔ جس کی جمالیاتی قدر و قیمت کو کسی ایک جزو ترکیبی کا مرہون منت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

A. C. Bradley کی رائے یہ ہے کہ

"When we are reading a poem we do not see Substance and Form apart. This distinction between Substance and Form is valid but not relevant in connection with aesthetic value" [۲]

---

[۱] شعر اقبال صفحہ ۳۶۵

[۲] Studies in Iqbals' Thought and Art P-459

رہا شعر میں مقصدیت کا معاملہ تو مقصدیت کی درجنوں تہیں اور سطحیں ہو سکتی ہیں مگر کسی مفکر اور فیلسوف کے نظریات کے محوری نقطے کا بار بار اور بالاصرار بیان، عام اور غیر مفکر اور خصوصاً غیر فیلسوف شعراء کی مقصدیت سے کئی درجے مختلف ہے —— چنانچہ ایک مخصوص نظریۂ کائنات اور نظریۂ حیات رکھنے والا شاعر جہاں کائنات کے مختلف مناظر و مظاہر میں اپنی تائید کے لئے گوناگوں عناصر جابجا جلوہ گر پاتا ہے اور انہیں کسی ایک اصول کے توسط سے مربوط کرتا ہے۔ وہاں وہ ان عناصر کی کھوج میں بھی رہتا ہے جو نہاں ہیں اور جن کو کام میں لائے بغیر یا جن کی تائید کے بغیر ایک مخصوص نظریئے پر استوار ہونے والے قصر معانی کی تعمیر میں کسر باقی رہ جاتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ علامہ اقبال "آنچہ می بایست پیش تو کجاست" کا آوازہ بلند کرتے ہیں

جو جو کچھ کارخانۂ قدرت میں ہے وہ اس سے بہت کچھ زیادہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہذا نئے نئے جہانوں اور نئے نئے زمانوں کی دریافت کے طالب ہیں۔

ے فروغ بندۂ خاکی ز تازہ کاریہاست!
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند!

ے طرحِ نَو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم!
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی!

ے گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می باید

اور اسی "آنچہ می بایست" کی جستجو ہے جو یہ کہلواتی ہے۔

~ غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند!
چہ آید زاں غزلخوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است

اور اسی ذوقِ جستجو کے باعث اور ایک طرح کے جذبۂ تسخیر کے فیض سے مزاج میں وہ یکسوئی در آئی جس نے دنیا داری کے ہر رنگ سے بے نیاز کر دیا۔ چنانچہ خانقاہی فقرار کے بجائے انہیں شاہینوں کا فقر پسند آنے لگا۔ اس لئے کہ شاہیں بقولِ علامہ اقبال آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے۔ اپنا شکار خود تلاش کرتا ہے۔ شکار مردہ نہیں کھاتا۔

تو گویا علامہ اقبال کا فقر خانقاہی ریاضت کا عطا کردہ نہیں بلکہ ذوقِ تسخیرِ فطرت کی محویت کا فیض ہے۔ جتنے مقاصد بلند ہوں نظر بھی اتنی ہی بلند ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا پرتو پڑنے لگتا ہے۔ ان کے سخت کوش، بے نیاز، خود نگر اور جہاں بیں فقر کے چند مضامین دیکھئے۔

~ قلندریم و کرامات ما جہاں بینی است!
ز ما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی

~ فقر را نیز جہاں بان و جہاں گیر کنند!
کہ بایں راہ نشیں تیغِ نگاہے بخشند

~ مستِ کلیم و ذوقِ فغانے نداشتیم　　غوغائے ما ز گردشِ پیمانۂ دل است

بچشمِ اہلِ نظر از سکندر افزوں است
گداگرے کہ مآلِ سکندری داند

حاجتے پیشِ سلاطین نبرد مُردِ غیور
چہ تواں کرد کہ از کوہ نیابد کاہے

گناہِ ما چہ نویسند کاتبانِ عمل !!
نصیبِ ما ز جہانِ تو جُز نگاہے نیست

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

چوں بہ کمال می رسد فقر دلیلِ خسروی است
مسندِ کیقباد را در تہِ بوریا طلب

مقامِ آدمِ خاکی نہاد دریا بند!
مُسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری   بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را!

علاّمہ اقبال کے اسس مخصوص رنگِ فقر کی چھاپ اور اِس ئے کا اثر ان کی فارسی غزلوں پر سرتاسر نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے علاّمہ اقبال بھی ایک حد تک صوفی ہیں۔ صوفی بھی اسرار کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تصوّف کے عام اسلوب سے علاّمہ اقبال کی راہ جُدا تھی۔

رمز و ایما بیانِ محبت کی جان ہے لہٰذا غزل کی روح ــــــ علاّمہ اقبال نے اسس ذیل میں کہا تھا۔

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائیست !!
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست !

مگر علاّمہ اقبال محض کمالِ فن کی داد نہیں چاہتے تھے ۔ وہ معلّم اور رہبر کی حیثیت بھی رکھتے تھے ۔ ان کے واضح مقاصد تھے جن کی تلقین وہ اپنے نغموں کے توسّط سے کر رہے تھے ۔ اسس لئے لازم تھا کہ ان کی غزل عیاں بھی ہوتی اور نہاں بھی ۔ متوسّط درجے کے اہلِ ذوق بھی لطف لیتے اور خواص بھی حظّ اٹھاتے ۔ چنانچہ علاّمہ اقبال کے اشعارِ غزل پر رمز و ایما اور اشارہ مسلّط نہیں ہوا۔ یہی عالم صنائع و بدائع کا ہے ــــــ علاّمہ اقبال نے رعایات تنسیقات تضاداتؔ اور استعارات اور مجازات کو بھی برتا۔ مگر اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ایمائیت اور "برہنہ گفتن" کے بارے میں کہتے ہیں۔

بکسے عیاں نکردم ز کسے نہاں نکردم
غزل آنچناں سرودم کہ بروں فتاد رازم

چنانچہ اسس اعتدال کی مثال دیکھئے :۔

لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز !
سپر از دست میندار کہ جنگ است ہنوز

دوسرا مصرعہ صاف ہے مگر پہلے مصرعے میں لالہ سے مراد امت مسلمہ ہے۔"ایں چمن" پوری دنیا بھی ہے اور برعظیم پاک و ہند اور ممالک اسلام بھی۔ اور مقصود بہر حال اسلامی دنیا ہے رنگ کا مقصد خون ہے۔ گویا ایک ہی شعر میں ایما اور "برہنہ گفتن" دونوں موجود ـــــــ

علامہ اقبال فارسی غزل کے اسرار و رموز اور اشارات و علامات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس امر پہ استاذی سید عابد علی عابد نے اپنی تصنیف دلپذیر "شعر اقبال" میں بڑی تسلی بخش بحث کی ہے۔ چنانچہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شمع، پروانہ، لالہ، گل، غنچہ، بہار، خزاں، مرغ چمن، بادہ، ساقی، قفس شاہین، کبوتر، نے، نے نواز زخم، زخم، غمزہ، ناز، انداز، کرشمہ وغیرہ کے اصطلاحی معنی سے آشنا تھے۔ اور یہی نہیں بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق ان اسلحہ اظہار کو بھی نئی شان، نیا دم اور نئی کاٹ عطا کر دیتے تھے۔ تاہم حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رمزی انداز کے شعروں کو چیستاں نہیں بنایا۔ کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ــ زبادۂ کہ بخاک من آتشے آمیخت !
پیالۂ بجوانانِ نو نیاز آور !!

ــ بہ نیستانِ عجم بادِ صبحدم تیز است !
شرارۂ کہ فرو میچکد ز ساز آور !

ــ غنچۂ دلِ گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے
تازہ کن از نسیم من داغ درونِ لالہ را

من بندۂ آزادم شاید کہ گریزم باز !
ایں طرۂ پیچاں را در گردنم آویزی

بہ ہوائے زخمۂ تو ہمہ نالۂ خموشم !
تو بایں گماں کہ شاید ز نوا فتادہ سازم

دام ز گیسواں بدوش زحمتِ گلستاں بری
صید چرا نمی کنی طائرِ بامِ خویش را

قافلہ بہار را طائرِ پیش رس نگر ! !
آنکہ بخلوتِ قفس گفت پیامِ خویش را

فاختۂ کہن صفیر نالۂ من شنید و گفت
کس نہ سرود در چمن نغمۂ پارہ ایں چنیں

میکدۂ تہی سبو حلقۂ خود فرامشاں !
مدرسۂ بلند بانگ بزمِ فسردہ آتشاں

؎ دریں محفل کہ کار او گذشت از بادۂ و ساقی
ندیمے کو کہ در جامش فرو ریزم مے باقی!

؎ می تواں ریخت در آغوش خزاں لالہ و گل
خیز و در شاخ کہن خون رگ تاک انداز

؎ بجلال تو کہ در دل دگر آرزو ندارم!
بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

؎ بیار آں دولت بیدار و آں جام جہاں بیں را
عجم را دادۂ ہنگامۂ بزم جمے دیگر!!

؎ قدحے خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را
ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد!

؎ از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید!

؎ من جواں ساقی و تو پیر کہن میکدۂ! بزم ما تشنہ و صہبا نہ تو داری و نہ من

- مطرب میخانہ دوش نکتہ دلکش سرود !
باده چشیدن خطاست بادہ کشیدن رواست

- آتش از نالہ مُرغانِ حرم گیر و بسوز !!
آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں

- بیا کہ بُلبُل شوریدہ نغمہ پرداز است !
عروس لالہ سراپا کرشمہ و ناز است !

یہ اشعار "مشتے از خروارے" ہیں۔ ان کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ غزل میں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ کہنے والے کو کہنے کا ڈھنگ آنا چاہیئے۔ بظاہر یہ مضمون غزل کے کہاں ہیں کہ "اے خدا میری قوم کو قرونِ اولیٰ کا ایمان عطا کر۔ میں اس ایمان کی جھلک اپنی قوم کے سادہ دل نوجوانوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

"اب مدرسہ و خانقاہ میں غیرت و خودداری کا جوش باقی نہیں رہا۔ خانقاہ میں محض خلوت نشینی کی رسم باقی رہ گئی ہے۔ رہا مدرسہ تو وہاں بے روح تعلیم جاری ہے۔"

"قوم کو ولولۂ تازہ کی ضرورت ہے۔ مگر قوم کے دینی راہنما میری بات نہیں سمجھتے خود ان کی اپنی گرہ میں کچھ ہے نہیں۔"

"کسی ایسے شخص کو راہنما بناؤ جو محض مادی علوم کا رسیا نہ ہو جو صاحبِ ایمان و روح بھی ہو۔"

"مغربی علوم مادہ پرست بنا دیتے ہیں، عقل کو چمکاتے ہیں لیکن روح کی تسکین کا باعث نہیں بنتے۔"

"اے خدا میری قوم بزدل ہو رہی ہے۔ اسے غازیوں اور مجاہدوں کا سا ولولہ عطا کر دے۔"

"اے میری قوم کے فرزندو تم جس مغربی فلسفے پر نظریۂ حیات تعمیر کرنا چاہتے ہو وہ غلط ہے۔ اپنے اصل سرچشموں کی طرف لوٹ آؤ۔"

"میں کسی ایسے صاحبِ ایمان و عشق کی تلاش میں ہوں جو میری طرح کا دل جلا ہو۔ وہی میری بات سمجھے گا اور اسی پر میری تعلیم اثر کرے گی۔"

"قوم کے عاشق تو اتنا جانتے ہیں کہ اگر قوم کی راہ میں دیوانگی اختیار کرنا ہے تو پھر پوری طرح دیوانے ہو جاؤ۔"

غرض یہ اور ایسے درجنوں مضامین بظاہر منبر و وعظ کے دائرہ کار سے تعلق رکھتے ہیں، یہ جلسۂ عام کے لئے موزوں ہیں مگر علامہ اقبال نے انہیں شایانِ غزل اور جانانِ غزل بنا دیا۔ اور اس طرح فارسی غزل کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا کر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وکٹر ہیوگو نے کہا تھا "ہر ذرہ ایک موضوع ہے۔ اور وہ کسی صاحبِ فن کا منتظر ہے" ——— یہ بسیط رائے ہے، اسے محدود کر کے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر شے غزل کا موضوع بن سکتی ہے۔ مگر کہنے والا "عاشق" چاہیئے ——— جو اصحاب نظر اور اربابِ فن ہیں علامہ اقبال کی فارسی غزل کو دیکھ کر بخوبی جان سکتے ہیں کہ شدید مقصدیت نے بھی ان کی غزل کی ساحری، فن کاری اور اثر انگیزی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ——— ان کی غزل حساس دلوں کے تاروں

کو بڑی ربودگی اور سرشاری کے عالم میں چھیڑتی ہے ـــــــ حق تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کی غزل کو مقصدیت نے وحشت اور انتشار سے بچایا ہے۔ مقصدیت ان پھولوں کے لئے رشتۂ گلدستہ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

واضح ہے کہ کسی فن کار کی شناخت کچھ ہے اور کسی کی شناخت کچھ، اور علامہ اقبال ایک مسلمان فن کار ہیں۔ ان کے نظریات، اُن کا ذوقِ تجدد اور جذبۂ تسخیرِ مسلم قوم کے ضمن میں ان کے احساسِ ذمہ داری وغیرہ کے جلوے اُن کے کلام میں بالکل واضح ہیں۔

؎ نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم
تواں ز گرمیٔ آوازِ من شناخت مرا

آخر میں جی چاہتا ہے کہ لبِ لباب کے طور پر اے جے آربری صاحب کے چند کلمات درج کر دیئے جائیں۔ یہ کلمات موصوف کے ترجمۂ "زبورِ عجم" ـــــــ Persian Psalms کے دیباچے کا حصہ ہیں۔ آربری صاحب کہتے ہیں:۔

"اقبال نے غزل کو ہیئت و مواد کی روایتی پابندیوں سمیت قبول کر لیا۔ اس لئے کہ انہیں وہ ایسی ہی شکل میں ملی تھی۔ پھر وہ صحیح معنوں میں اپنے جوہرِ عبقریت کا پرتو ڈال کر اسے ایک منزل آگے لے گئے۔

انہوں نے غزل کے سانچے اور صورت کو تو بڑی وفاداری کے ساتھ بحال رکھا۔ مگر اسے اپنے مخصوص و منفرد پیغام کا وسیلۂ اظہار بنا کر اس کی ہیئت کو نئے معانی عطا کر دیئے ـــــــ

گویا اب پہلی بار غزل کی قدیم ہیئت پر جدید فلسفے کا ملبوس سجا دیا گیا۔

جب قاری اقبال کے اظہارات کا توجہ سے مطالعہ کرے گا تو خود کو اس امر کی شناخت پر بخوبی قادر پائے گا کہ عام الفاظ اور عام دلالتوں کے پیچھے اُن کے کیا کیا مخصوص مطالب جلوہ گر ہیں۔ چنانچہ قاری ایک حیرتناک تازگی و رعنائی کے ساتھ ساتھ اظہار کی مبہوت کن گیرائی اور گہرائی ملاحظہ کرے گا۔ وہ اپنے آپ کو فکر و احساس کی ایک نئی دنیا میں پائے گا ——— وہ دنیا جس میں امید و آرزو اور عظیم سعی و جستجو کا ارتعاش ہے ——— وہ دنیا جس میں ایک ایسے عظیم مفکر کی بصیرت جلوہ بار ہے جس نے دکھوں سے بھرپور اور تہ و بالا ایام میں آنے والے نئے دَور کی سحر کا نظارہ کر لیا تھا۔" [۱]

---

[۱] Preface · Persian Psalms Published by Sh. Mohommad Ashraf*

تا تُو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ !
عِشق کارے است کہ بے آہ وفغاں تیز کنند

——— اِقبال

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد
خوشا کسے کہ بدُنبالِ محمل است ہنوز

——— اِقبال